شوکت صدیقی

# راتوں کا شہر

# راتوں کا شہر

شوکت صدیقی

# راتوں کا شہر

ادارہ ادبیاتِ نو۔ لاہور

ناشر: محمد صدیق

مقام اشاعت: ادارۂ ادبیاتِ نو.

بیرون لوہاری دروازہ لاہور

مطبع: اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

تاریخ اشاعت: نومبر

قیمت: چار روپے آٹھ آنے

# ترتیب

خداداد کالونی، ۷
خلیفہ جی ۵۵،
راتوں کا شہر، ۸۳

شریف آدمی، ۱۱۵
سیاہ فام، ۱۴۱
ہفتہ کی شام، ۱۵۵

چاند کا داغ، ۱۸۱
خان بہادر، ۲۰۱

تاریکی کا جال، ۲۱۷
انٹرویو، ۲۴۳
چور دروازہ ۲۶۷

# خداداد کالونی

اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے سائے میں وہ دونوں بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ہر طرف کہر کا غبار پھیلا ہوا تھا اندھیرے میں وہ بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ باطم نے اکتا کر انگڑائی لی اور آہستہ سے بولا "چل یار۔ اب تو نیند معلوم ہو رہی ہے۔" غازی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا، اسی وقت سامنے درختوں کے نیچے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا "شی! کوئی آ رہا ہے۔" سنسان سڑک پر قدموں کی آہٹ صاف سنائی پڑ رہی تھی۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے جھٹ سے شلوار کے نیفے سے چاقو نکالا اور باطم کی کمر میں کہنی مار کر بولا "لے بے کام بن گیا"

دونوں اندھیرے میں دبے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

آنے والے کے قدموں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر اندھیرے میں ایک دھندلا سا انسانی سایہ نظر آیا اور جیسے ہی وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے سامنے پہنچا دونوں لپک کر شکاری کتے کی طرح اس کے سر پر جا پہنچے۔

بالم نے ڈانٹ کر کہا "ہے ٹھہر جا"

اور غازی نے چاقو اس کے سینہ پر رکھ دیا "سالے! ذرا بھی آواز نکالی تو پورا چاقو اتار دوں گا" نووارد لمحہ بھر تو بھونچکا سا کھڑا رہا کہ یہ کیا مصیبت نازل ہوئی پھر اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"اماں! یہ چاقو تو سامنے سے ہٹاؤ۔ تم تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مار ہی دو گے مطلب کی بات کہو۔ تم چاہتے کیا ہو؟"

اس کی اس دیدہ دلیری پر غازی نے ایک بار تو چاقو والا ہاتھ پیچھے کھینچ ہی لیا۔ دونوں حیرت سے اس پستہ قد کے آدمی کو دیکھنے لگے۔ جو کانوں پر گلوبند لپیٹے سردی سے سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔

بالم نے اپنی بھاری آواز سے ایک بار پھر اس کو ڈانٹا "بے کہتا کیا ہے، جو کچھ ہے نکال کر سامنے رکھ دے" فوراً ہی غازی نے چاقو پھر اس کے سینہ پر رکھ دیا۔ مگر وہ منحنی جسم والا راہ گیر اس دفعہ بھی مرعوب نہ ہوا اسی لہجے میں کہنے لگا۔

"اماں پھر تم نے چاقو سامنے رکھ دیا۔ بابا ناراض کیوں ہونے ہو یہ لو" اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ان سے بولا "لو سنبھالو! پورے ۱۲ آنے کی ریزگاری ہے، البتہ اس میں ایک دونی کھوٹی ہے۔ بعد میں مجھ کو گالیاں نہ دینا۔ یہ رہا بیڑی کا بنڈل۔ ماچس بھی ساتھ میں ہے۔ کہو تو کوٹ بھی اتار دوں۔ اس کو نہ لو تو اچھا ہے۔ ابھی مجھ کو کئی میل جانا ہے۔ سردی میں اکڑ کر جاؤں گا"

اس کی باتیں سن کر دونوں بڑے چکرائے۔ غازی نے ریزگاری اور بیڑی کا بنڈل لینے کو تو اس سے لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا کرے واپس کر دے یا رکھ لے۔ کم از کم اس وقت کے چائے پانی کا تو خرچہ نکل ہی آئے گا۔ بالم نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اور خاموشی سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ جیبوں کی تلاشی سے جب کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو وہ اس کے پاجامہ کا نیفہ ٹٹولنے لگا۔ وہ آدمی اس کا مقصد بھانپ گیا تھا۔ جھٹ سے بولا "نہیں جی تم میری پوری ننگا جھوڑی سے لو یہیں پاجامہ اتار کے دیتا ہوں اچھی طرح دیکھ لو" اتنا کہہ کر وہ آزار بند کھولنے لگا۔

غازی اس کی اس تیزی پر جل کر چیخا "نہیں بے، اس کی ضرورت نہیں۔ سالے زیادہ تیزی دکھائی تو لگاؤں گا دو ہاتھ" کہنے کو تو اس نے اکڑ فوں میں یہ بات کہہ دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ آج بڑے بہاڑ سے پالا پڑا ہے۔ بالکل یہی بات بالم نے بھی سوچی۔

مگر اس نے خود پر زبردستی غصہ کا سا عالم طاری کرتے ہوئے اس شخص کی کمر پر کس کے ایک لات ماری اور چیخ کر بولا۔

"بس سیدھا ناک کی سیدھ میں چلا جا۔ مڑ کر دیکھا تو سمجھ لینا سالے خاں تمہاری خیریت نہیں"۔

اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ دونوں خاموش کھڑے اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر نہ جانے غازی کو کیا خیال آیا۔ اونچی آواز سے اس کو پکارنے لگا "ہے ٹھہر جاؤ" اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف چل دیا۔ بالم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا غازی نے قریب جا کر ۱۲ آنے کی ریز گاری اور بیڑی کا بنڈل نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"لے بھئی لے۔ یہ رہی تیری رقم"۔

اس دفعہ اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے بات کر رہا تھا۔ وہ آدمی کہنے لگا "نہیں جی، تم مجھ کو صرف ایک دونی دے دو کہ ایک کپ چائے پی لوں۔ اور ہو سکے تو ایک بیڑی سلگا کر دے دو" غازی اب اس پر مہربان ہو چکا تھا۔ ہنس کر بولا۔

"اب تم اس کو رکھ لو۔ چائے ہم تم کو پلائیں گے اور بیڑی کے بجائے لو یہ سگریٹ پیو"۔

اس نے جیب سے پاسنگ شو کی ڈبیا نکالی۔ اور سگریٹ دے کر ماچس سے سلگانے لگا۔ بالم نے اس بات پہ کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ ہنس کر بولا۔

"یار ادھر بھی تو ایک سگریٹ بڑھاؤ۔"

سگریٹ سلگا کر تینوں سڑک پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تین مٹی کے چولہے پر ایک چائے خانہ کے اندر جا کر انہوں نے چائے پی۔ جب وہ باہر آئے تو ایک بج رہا تھا۔ غازی کو وہ شخص کچھ پسند آ گیا تھا۔ اس نے سوچا آدمی اپنے کینڈے کا ہے۔ اگر ساتھ میں آ جائے تو اچھا ہے۔ اسی لیے وہ اس سے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ سردی برابر بڑھتی جا رہی تھی اور ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ غازی کہنے لگا۔

"اماں اس جاڑے پالے میں کہاں جاؤ گے۔ اپنے ہی ساتھ ٹھہر جاؤ۔ اب رات رہ ہی کتنی گئی ہے۔ نیند نہیں آئی گی تو چائے کا ایک دور اور چلے گا۔ یہاں تو رات بھر ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔"

ذرا سی حیل و حجت کے بعد وہ ان دونوں کے ساتھ ٹھہرنے پر رضامند ہو گیا۔ تینوں چلتے چلتے سڑک کے کنارے بنی ہوئی لکڑی کی ایک دکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ بالم بولا۔ "لو بھئی اپنا ٹھیا آ گیا۔" اس نے جھک کر دکان کے نیچے دیکھا، پھر غازی سے پوچھنے لگا۔

"موم بتّی جلالوں"۔

"جلالو تو اچھا ہے"۔ وہ بولا۔

بالم دکان کے نیچے گھس گیا۔ اسی وقت اندر سے ایک کتیا نکل کر تیزی سے بھاگی اور ذرا دور ہٹ کر زور زور سے بھونکنے لگی۔ اندر سے بالم کی آواز سنائی دی۔

"لو یار اپنا تو پلیتھن ہوگیا۔ اس حرام زادی نے تو یہاں بستر میں بچے جنے ہیں"۔

اُس کی باتوں کے ساتھ ساتھ اندر سے پلّوں کے پیاؤں پیاؤں کرنے کی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ غازی گھبرا کر بولا "مارو یار حرام کی جنی نے، جب ہی تو میں کہوں کہ یہ سالی آج اس طرح کیوں بھونک رہی ہے"

بالم وہیں سے بولا۔

"تو ان سالوں کو بستر سے نکال کے کہاں ڈالوں؟"

غازی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے اور ادھر کتیا تھی کہ برابر بھونکے جا رہی تھی۔ وہ مخمصہ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔ "ان کو نکالو گے تو سالے سردی میں مر جائیں گے۔ اور یہ سالی کب سونے دے گی اس حرام زادی نے تو خاصی مصیبت کھڑی کر دی"۔ جھنجھلا کر وہ کتیا پر لپکا اور اس کے منہ پر ایک لات ماری۔ وہ ٹیں ٹیں کرتی دور چلی گئی۔ مگر ذرا دیر بعد پھر

قریب آکر بے تحاشہ بھونکنے لگی۔ بالم دکان کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ دونوں بے حد پریشان معلوم ہو رہے تھے۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

"بھئی اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ چلو میرے ساتھ کسی نہ کسی طرح رات کاٹ لیں گے۔"

دونوں کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا۔ غازی نے جوش میں آ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ "بار ٹیپی تو تو واقعی بڑے کام کا آدمی ہے ورنہ اس حرام زادی نے تو آج رات مار ہی دیا تھا۔" تینوں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور خداداد کالونی کی طرف چل دیئے، جہاں ٹیپی رہتا تھا۔ پستہ قد کا وہ مسکین سی شکل و صورت کا آدمی، جس کی دیدہ دلیری سے غازی بری طرح متاثر ہو چکا تھا اور جس کے متعلق بالم کا خیال تھا کہ وہ بڑا خطرناک آدمی لگتا ہے۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد تینوں خداداد کالونی پہنچ گئے۔ غازی کو یہ بستی بہت پسند آئی۔ سڑک کے ایک جانب بڑی شاندار کوٹھیاں بنی تھیں دوسری طرف اونچی نیچی جھونپڑیاں تھیں۔ کوٹھیوں میں کہیں کہیں اب تک روشنی ہو رہی تھی۔ جھونپڑیوں میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چاروں طرف گھرا سناٹا تھا۔

ٹیپی کا گھر ان کوٹھیوں کے بیچ میں تھا۔ یہ ایک بڑی سی عمارت تھی مگر اس کی تعمیر نامکمل رہ گئی تھی۔ اس کا مالک کوئی ہندو سیٹھ تھا جو ہندوستان

چلا گیا تھا اور یہ عمارت متروکہ جائداد قرار دے دی گئی تھی۔ اس وقت اس میں بہت سے مہاجر خاندان آباد تھے۔ جنہوں نے مٹی کی دیواریں اور پھوس کی ٹٹیاں کھڑی کر کے، سر چھپانے کا ٹھکانہ پیدا کر لیا تھا۔ لیکن ٹینی کے پاس پورا ایک کمرہ تھا۔ اوپر چھت تھی۔ فرش بھی پختہ تھا۔ البتہ دیواروں پر پلاستر نہیں ہو سکا تھا۔ دروازہ خود اس نے اپنے صرفہ سے لگوایا تھا۔

ٹینی نے کمرے کے اندر جا کر لالٹین جلائی تو غازی اور بالم نے بڑی حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ کمرے کے اندر ایک طرف چارپائی پڑی تھی۔ قریب ہی پانی سے بھرا ہوا گھڑا اور کچھ برتن موجود تھے۔ سامنے دیوار پر لکڑی کا ایک تختہ لگا تھا۔ جس پر ایک چوکور آئینہ، تیل کی شیشی اور کنگھا رکھا تھا۔ غازی نے کمرے میں چل پھر کر ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیا اور بستر کے سرہانے پڑی ہوئی فلمی گانوں کی کتاب اٹھا کر لالٹین کی روشنی میں نظریں گڑو گڑو کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ اس کو نہ پڑھ سکا تو ٹینی کے سامنے کتاب ڈال کر کہنے لگا۔

"اپنے نوجوان پڑتا ہے کہ پڑھ لکھ بھی لیتا ہے۔"

ٹینی انکساری برتنے کے سے انداز میں بولا "نہیں جی، بس یونہی اٹکل پچو سے کام نکال لیتا ہوں۔" غازی کو جیسے اس کی یہ بات اچھی نہ لگی، اس لیے وہ اس موضوع کو نظر انداز کر کے بالم سے پوچھنے لگا۔

"کیوں بلے کیا جنجال ہے۔ یار مجھ کو تو یہ مکان بڑے ٹھاٹھ کا لگا۔"

وہ بولا۔" ہاں جی بڑا اچھا گھر اس کے ہاتھ لگ گیا۔"

ٹلیتی اکڑ کر بولا۔" یوں ہی نہیں ملا۔ پورے سو روپے خرچ کر کے قبضہ ملا ہے۔"

غازی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔" کیوں نہیں۔ اس سے کم میں کیا ملا ہوگا۔ پھر جگہ بھی مرقع کی ہے۔ ایک ہی دفعہ کام بن جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔" بالم نے بھی اس کی تائید کی۔ کہنے لگا۔

"ایک سے ایک بڑھیا کوٹھی بنی ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی موٹی مرغی پڑی ہے۔"

ٹلیتی جو ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے گھر کی تعریف سن کر خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ ان باتوں کو سنکر سٹ پٹا گیا۔ جلدی ہی بیچ میں بول پڑا۔" دیکھو جی یہ اپنا دھندا تم اپنے ہی علاقہ میں کرنا۔ اس بات کی میں یاری نہیں پالتا۔ رات یہاں بسر کرو اور سیدھے سیدھے اپنے گھر کا راستہ لو۔" بالم کو اس کی یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"ابے تو اتنا اکڑتا کیوں ہے۔ چلے نہیں جائیں گے تو کیا یہیں ڈیرے ڈالے پڑے رہیں گے۔ اور تجھ کو زیادہ کھل رہے ہیں تو لے ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ چلنے کے لیئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹلیتی دھیما پڑ گیا۔ منانے کے سے انداز میں کہنے لگا۔" یار تو نے حد کر دی۔ میرا یہ مطلب کب تھا۔ چل بیٹھ

اب جاڑے پالے میں کہاں جائے گا۔" نمازی نے بھی سوچا کہ اب اس گرم گرم کمرے سے باہر نکل کر سردی میں جانا خاصہ کٹھن مرحلہ ہے۔ کہنے لگا۔

"بالم یار تو بڑا تیز ہے۔ سالا ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ تو نے بھی کس کی بات کا برا مانا۔ ارے یہ ٹلینی تو اب اپنا یار ہو گیا ہے۔ میں نے تو سوچا ہے کہ اس کو بھی ٹولی میں شامل کر لیا جائے۔ آدمی کام کا ہے۔ ذرا اناڑی ہے ٹھیک ہو جانے لگا۔ جس دن واؤں لگ گیا اور کرارے کرارے نوٹ سامنے آئے۔ سب بھول جائے گا۔"

بالم روٹھا ہوا سا بیٹھ گیا۔ ٹلینی ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "تم دونوں ابھی لونڈے ہو۔ میں تم سے بہت پہلے سارے پاپڑ بیل چکا ہوں۔ چوری بھی کی۔ چاقو بھی چلائے۔ جیل بھی کاٹی۔ سارے جتن کر چکا ہوں۔ مگر بھائی خدا ان پولیس والوں سے بچائے۔ موت کے فرشتہ کی طرح ایک بار گھر دیکھ لیا۔ تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کہیں واردات ہوئی خواہ مخواہ پکڑ بلوایا کسی کے یہاں دنگا فساد ہوا۔ نزلہ سب سے پہلے ادھر گرا۔ اسی لیے گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ بابا اب اپنے میں بوتا نہیں ہے۔ جس دن کھو کھرا پار کی سرحد میں داخل ہوا۔ اسی دن توبہ کر لی تھی کہ اب یہ کام نہیں کروں گا۔ اب تک اللہ میاں کا کرم ہے کہ اپنی بات پر قائم ہوں تھوڑی بہت جو باقی ہے، اسی طرح عزت کے ساتھ گذر جائے تو اس کا لاکھ لاکھ شکر!" دونوں خاموشی سے بیٹھے اس کی باتیں

سنتے رہے۔ ذرا دیر کمرے کے اندر خاموشی رہی۔ پھر غازی کی آواز ابھری۔

"پر بابر کریں تو کیا۔ لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں یہاں اللہ کا نام ہے۔ کوئی دست کاری بھی نہیں آتی۔ کام کاج کہیں ملتا نہیں۔ چھوٹا موٹا دھندا کریں تو اس کے لئے رقم کہاں سے لائیں۔"

ٹیلنی کو جیسے پہلے ہی سے علم تھا کہ وہ یہی کہیں گے۔ وہ بڑے اطمینان سے ان کو سمجھانے لگا۔ "کوشش کرو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کہیں محنت مزدوری کرو۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تم پولس کے ہتھے نہیں چڑھے۔ پھر یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ ہر وقت جان سولی پر۔ کہیں پولس والا نظر آگیا، خون خشک ہو گیا۔ خواہ مخواہ ان کی خوشامد کرو اور گالیاں گھاتے میں کھاؤ۔ بھئی میں تو تمہارے ہی بھلی کی کہتا ہوں۔"

بالم ابھی تک چپ تھا۔ البتہ غازی کچھ کچھ رضامند ہوتا جا رہا تھا کہنے لگا۔ "اچھا جی، یوں ہی سہی۔ چلو تمہاری بات مانی۔" ٹیلنی نے بیڑی سلگا کر ایک لمبا کش لگایا اور پھر دنیا کے اونچ نیچ دکھا کر ایک لمبا سا لکچر دے ڈالا۔

رات کے پچھلے پہر تک، تینوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ہر ایک نے دل کی بات صاف صاف کہہ ڈالی۔ غازی تو پہلے ہی ٹیلنی کا مرید ہو چکا تھا۔ بالم بھی رفتہ رفتہ اس کی باتوں پر ایمان لے آیا۔ اس عرصہ میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاصہ گھل مل گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ تینوں اب

اکٹھا رہیں گے۔ ٹینی سویرے کام پر چلا جائے گا۔ اور وہ دونوں ویسٹ وہارف جایا کریں گے۔ وہاں جہازوں پر سے سامان اتارنے کے لئے قلیوں کی بھرتی ہونے والی ہے۔ کچھ عرصہ تک تینوں اس طرح محنت مزدوری کریں گے۔ اس کے بعد جب ہر ایک کے پاس سو سو روپیہ اکٹھا ہو جائیں گے تو تینوں مل کر کوئی کاروبار شروع کر دیں گے۔ یہ اسکیم تیار کرنے کے بعد ٹینی نے اٹھ کر فرش پر بستر بچھایا۔ اور تینوں اسی کے اندر کسی نہ کسی طرح دبک کر سو گئے۔

ٹینی حسبِ معمول سویرے بڑے تڑکے اٹھ بیٹھا۔ اس نے جلدی سے انگیٹھی سلگائی۔ چائے کا پانی چڑھایا۔ تھوڑی دیر میں دودھ والا بھی آ گیا۔ پھیری والے سے اس نے تین بن بھی خرید لیئے۔ جب وہ چائے تیار کر کے اٹھا تو دھوپ سامنے میدان میں پھیل چکی تھی۔ وہ دونوں ابھی تک بے خبر سو رہے تھے۔ ٹینی نے بڑی مشکل سے ان کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دونوں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ٹینی نے لوٹے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ دونوں منہ ہاتھ دھو کر آئے تو چائے کی پیالیوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کھانے کے لیے بن بھی موجود تھے۔ دونوں کو کئی سال بعد پہلی بار صبح اٹھنے کی خوشی میسر ہوئی تھی۔

تینوں نے چسکیاں لے لے کر چائے پی اور پھر رات کے پروگرام کے مطابق اپنی اپنی منزلوں کو چل دیئے۔

شام کو جب ٹینی پلاسٹک کے کارخانے سے واپس لوٹا تو اس نے

دیکھا کہ وہ دونوں دروازے پر پہلے ہی سے موجود تھے۔ دونوں کے نڈھال چہرے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کام بنا نہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قلیوں کی بھرتی تو ہو رہی ہے پر ٹھیکیدار دس دس روپے فی نفر رشوت لینا ہے۔ ٹینی نے ان کو بادل نہ ہونے دیا۔ ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہنے لگا :۔

"دل کیوں چھوٹا کرتے ہو۔ جب محنت ہی کرنا ٹھہری تو جہاز پر نہ سہی کہیں اور سہی۔ ڈھونڈو تو خدا مل جاتا ہے۔ کام کا ملنا کون سی بڑی بات ہے۔"

اس کی باتوں سے دونوں خاصے پر امید ہو گئے۔ دوسرے دن تینوں پھر گھر سے نکل کر اپنی اپنی سمتوں کو چل دیئے۔ اس روز بھی دونوں ناکام لوٹے۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے پاس یہاں آتے وقت جو دو چار روپے بچے رہ گئے تھے وہ بھی انہوں نے خرچ کر ڈالے تھے۔ ٹینی کو جلد ہی اس بات کا پتہ چل گیا۔ وہ ان کی اور بھی زیادہ ناز برداری کرنے لگا کہ کہیں وہ دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔ صبح اٹھ کر وہ اسی طرح ان کو چائے پلاتا۔ رات کو تینوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ وہ ان سے بے تکلفی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ مگر وہ ان سے جس قدر بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ وہ اسی قدر بیگانے سے ہوتے جا رہے تھے۔ اب وہ اس کو ٹینی کے بجائے اس کے اصلی نام یار محمد سے مخاطب کرتے۔ اس کی خواہ مخواہ خوشامد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس معاملہ میں غیر ارادی طور پر ان دونوں میں ایک مقابلہ شروع ہو گیا تھا کہ کون ٹینی کی زیادہ

خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ اب دن چڑھے تک سونے کے بجائے وہ تڑکے ہی اٹھ کر انگیٹھی سلگا دیتے اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ ٹلینی کے سو کر اٹھنے سے پہلے ہی چائے تیار ہو جاتی۔

ہفتہ بھر کی مدت میں دونوں خاصہ بدل گئے تھے۔ اس بات پر خود ٹلینی کو بھی تعجّب تھا۔ اب اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح دونوں دھندے سے لگ جائیں تو بہت اچھا ہے۔ آخر ایک روز ایسی امید نظر آ گئی اس کے ایک ملنے والے نے صابن کے ایک کارخانے میں دونوں کے لیے کام کی سبیل نکالی تھی۔ وہ اس دن بڑا خوش خوش گھر واپس گیا۔ ابھی تک وہ دونوں واپس نہیں لوٹے تھے وہ ان کے آنے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں اس کی نظر بستر پہ گئی تو وہاں سے رضائی غائب تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب جو اس نے دوسرے سامان کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ لوٹا بھی غائب ہے۔ اس بات سے اس کو بے حد صدمہ پہنچا۔

وہ رات اس کے لیے کاٹنا دوبھر ہو گئی۔ سردی بھی زیادہ تھی۔ اور ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس نے انگیٹھی سلگا لی اور اس پہ جھکا ہوا جسم میں گرمی پہنچاتا رہا۔ جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں تو انگیٹھی کے پاس ہی گنڈلی مار کر پڑ جاتا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد آنکھ کھل جاتی۔ پھر کوئلے دہکاتا اور نیند اس پہ پھر حملہ کرتی۔ ساری رات وہ ان دونوں کا انتظار کرتا رہا۔ نہ وہ واپس لوٹے اور

نہ وہ گھڑی بھر اطمینان سے سو سکا۔

صبح جب وہ کام پر گیا تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ مشین چلاتے چلاتے نیند کا جھونکا آجاتا۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا۔ اس روز اس نے ان کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ گھر واپس لوٹتے ہوئے اس نے بازار سے خالی بوریاں خریدیں۔ اور رات گئے تک ان کو جوڑ جوڑ کر سیتا رہا۔ ان سے رضائی کی سی گرمی اور آرام تو نہیں ملا۔ مگر نیند آ گئی تھی۔

کئی دن بعد کا ذکر ہے کہ وہ بوریوں کے سلے ہوئے ٹکڑے کے اندر دبکا ہوا پڑا تھا۔ کوئی ۱۱ بجے کا وقت تھا۔ ساری آبادی سنسان پڑی تھی کہ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ٹلینی نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ غازی اور بالم مجرموں کی طرح گردن جھکائے کھڑے تھے ایک کی بغل میں نئی رضائی دبی ہوئی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں جھلکتا ہوا لوٹا لٹک رہا تھا۔ ذرا دیر تک تینوں خاموش کھڑے رہے۔ ٹلینی روکھے پن سے بولا۔

"بس بھیا اب تو تم مجھ کو بخش ہی دو اور یہ دونوں چیزیں بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ مجھ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

غازی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ پیر سے جوتا نکال کر ٹلینی کے سامنے ڈال دیا۔ "دس جوتے مار لو ٹلینی بھیا، مگر اپنی زبان سے یہ بات نہ کہو۔" بالم جواب تک چپ چاپ کھڑا تھا۔ روہانسا سا ہو کر بولا

"اب ہم تو یہ طے کرکے آئے ہیں کہ یہ ساتھ چھوٹے گا تو بس اب مرکر ہی چھوٹے گا۔" اتنا کہہ کر وہ اس کے پیروں پر جھک گیا۔

ٹیلنی کا غصہ پہلے ہی کافور ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے بالم کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑے پیار سے بولا "یار بالم کیا غضب کر رہا ہے۔ تو تو میرا بھائی ہے۔" اس نے کھینچ کر اس کو گلے سے لگا لیا۔ بالم بچوں کی طرح رونے لگا۔

پھر تینوں کمرے کے اندر آ گئے تو غازی نے سب سے پہلی خوشخبری یہ سنائی کہ اس کو ایک ہوٹل میں کام مل گیا ہے اور بالم نے رکشا چلانے کا دھندا پیدا کر لیا ہے۔ ٹیلنی کو نئی رضائی اور نئے لحاف کے لینے سے زیادہ یہ بات سن کر خوشی ہوئی۔

تینوں پچھلے دنوں کی طرح ایک بار پھر بے تکلفی سے گالیاں بک بک کر باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں غازی بولا "ابے بالم، وہ ڈبہ کہاں ہے؟" بالم نے جھٹ سے جواب دیا۔

"ابے یار میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا۔"

اس نے ایک نٹ کھٹ بچھڑے کی طرح چھلانگ لگائی۔ اور رضائی کی تہہ کھول کر اس کے اندر سے ایک ڈبہ نکالا۔ اور اس کو کھول کر ٹیلنی کے سامنے رکھ دیا۔ ڈبہ کے اندر حلوا اور پراٹھے تھے۔ تینوں نے مزے لے

لے کر کھائے اور رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ٹیلنی بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ ان دونوں کے چلے جانے سے کمرے میں جو ویرانی برسنے لگی تھی وہ آج کئی روز بعد زائل ہو چکی تھی۔

سویرے اٹھ کر انہوں نے مل جل کر بڑی مستعدی سے چائے تیار کی اور خوشی خوشی اپنے کاموں پر چل دیئے۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ٹیلنی کو جیسے یقین ہو چلا تھا کہ اب تینوں مل کر تین سو روپے جلد ہی مہیا کر لیں گے اور پھر کاروبار کرنے کی اسکیم پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

انہی دنوں ایک روز خلافِ توقع غازی جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ وہ عام طور پر ۱۱ بجے رات تک ہوٹل کا کام ختم کر کے آتا تھا۔ ٹیلنی نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو گھبرا کر بولا:۔

"اماں! تم آج جلدی کیوں چلے آئے؟"

غازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ سلگتی ہوئی انگیٹھی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ دہکتے ہوئے کوئلے کی سرخ آنچ میں اس کا چہرہ پتھر کے مجسمہ کی طرح ٹھوس نظر آ رہا تھا۔ ٹیلنی نے اس دفعہ اصرار کر کے پوچھا۔

"یار کچھ بتاؤ تو سہی، آخر ہوا کیا؟"

غازی نے اس کی طرف اس طرح نظریں اٹھا کر دیکھا کہ جیسے دکھ سے ابھی وہ رو دے گا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"یار ٹلینی، میں نے نوکری چھوڑ دی۔"

اڑا اڑا دھم، ٹلینی کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا مکان کی چھت اس پر آ گری جلدی سے بولا۔"کیوں؟ بات آخر کیا ہوئی۔" غازی کہنے لگا۔"بات کیا ہوتی میں کام ختم کر کے لوٹ رہا تھا کہ نمبر ۱۲ کے مسافر نے مجھ کو آواز دی۔ میں اندر چلا گیا۔ وہ آج ہی دوپہر کو اس کمرے میں آیا تھا۔ سالے کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی ہوں گی، مجھ سے چھوٹتے ہی کہتا کیا ہے کہ کوئی لونڈیا لے کر آؤ۔ تم کو بھی خوش کر دوں گا۔ میرے آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہا بے تو نے مجھ کو کوئی بھڑوا سمجھا ہے۔ سچ کہتا ہوں ٹلینی بھائی چاقو نہیں تھا۔ نہیں تو سالے کے ٹکڑے کر ڈالتا۔ خاصی تو تو میں میں ہو گئی۔ مینیجر بھی وہاں آ گیا۔ وہ سالا الٹا مجھ پر گرجنے لگا۔" ٹلینی بیچ میں بول اٹھا۔

"تم نے مینیجر کو پوری بات سمجھائی ہوتی۔"

غازی بگڑ کر بولا۔"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اس کو سارا واقعہ نہیں بتایا"

"تب تو یار بڑی زیادتی ہو گئی۔"

وہ کہنے لگا۔"لو یار۔ اب ہم عورتوں کی دلالی کریں گے تف ہے ایسی زندگی پر۔"

وہ دیر تک بیٹھا گالیاں بکتا رہا۔ ٹلینی کبھی کبھار بیچ میں بول پڑتا یونہی باتیں کرتے کرتے ۱۲ بج گئے مگر باطم ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ دس بجے

سے پہلے ہی پہلے واپس آجاتا تھا۔ دونوں اس کا انتظار کرتے کرتے لیٹ گئے۔ کوئی ۳ بجے کے قریب ٹینی کی آنکھ کھلی۔ اس نے غازی کو جگایا۔ "اماں غازی یہ اپنا بالم ابھی تک نہیں لوٹا۔ خدا جانے کیا ہوا" اب تو اس کو بھی تشویش ہوئی۔ دونوں کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ بیٹھے سوچتے رہے کہ اس وقت کیا کیا جائے۔

صبح کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ سردی شدید ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بیڑے کر کے باہر جانے ہی والے تھے کہ چل کر بالم کا پتہ لگایا جائے کہ اتنے میں دروازہ کھول کر بالم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ مُردے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ غازی نے پوچھا۔

"اماں کہاں سے آ رہے ہو؟"

وہ بولا "حوالات سے!"

ٹینی نے گھبرا کر کہا "حوالات سے؟ آخر ہوا کیا؟"

وہ بتانے لگا "سالے نے موٹر الگ اور پر چڑھا دی پولیس نے توڑ ڈالی اور حوالات بھی دکھا دی۔ ٹانگ کا الگ یہ حال ہوا" اس نے شلوار چڑھا کر پنڈلی دکھائی تو اس پہ کالا کالا خون جما ہوا تھا۔

ٹینی نے بڑے دکھ سے سوچا کہ یہ بھی دھندے سے چھوٹا دونوں پہ ایک ہی روز مصیبت نازل ہونے والی تھی مگر اب کیا کیا جائے پھر

وہ کئی روز تک یہی بات سوچتا رہا۔ اور وہ دونوں ایک بار پھر روزی کی تلاش میں سویرے سویرے ہی نکل جاتے اور شام کو منہ لٹکائے واپس لوٹتے۔

ایک بار پھر دونوں کی تمام پونجی ختم ہونا شروع ہو گئی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں جھگڑ پڑتے۔ گالی گلوچ سے بڑھ کر، کبھی ہاتھا پائی تک کی نوبت آ جاتی۔ ایک دوسرے سے بڑی تک چھپا کر بیٹھے کہ کہیں دوسرا بڑی نہ مانگ بیٹھے۔ تنہائی میں وہ ایک دوسرے کے خلاف ٹلینی کے کان بھرتے ان میں آئے دن کی بڑھتی ہوئی کشیدگی سے ٹلینی بے حد پریشان ہو گیا تھا۔

گذشتہ چند روز سے غازی اور بالم میں ٹھنی ہوئی تھی۔ آپس میں بات چیت بھی بند تھی۔ دونوں سویرے سویرے ہی علیحدہ علیحدہ سمتوں کو کام دھندے کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ شام کو جب ٹلینی واپس لوٹا تو دونوں میں سے کسی کا پتہ نہیں تھا۔ رات گئے تک وہ بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں اس کو کئی بار تشویش پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے سامان کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ ساری اشیا جوں کی توں موجود تھیں۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے دونوں ساتھ ساتھ لوٹے۔ ان کے چہرے خلاف توقع بشاش نظر آ رہے تھے۔ آتے ہی بالم ٹلینی کے پاؤں دبانے لگا اور غازی نے جھٹ سے بڑی سلگا کر پیش کی۔ ٹلینی ہنس کر بولا "آخر یہ آج اتنی خوشامد کیوں ہو رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔" بالم دانت نکال

کر ہنسنے لگا اور غازی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یار محمد (ٹینی) پہلے ہی بھانپ جائے گا! اماں اس کے قبضہ میں ضرور کوئی موکل وکل ہے۔ جبھی تو دل کی بات پڑھ لیتا ہے۔"

غازی بھی مسکرانے لگا۔ "اب تو یہ بھانپ گیا ہے تو پھر کہہ ہی ڈے۔"

وہ بولا۔ "نہیں یار تو ہی کہہ۔"

دونوں ایک دوسرے سے اصرار کرنے لگے۔ ٹینی گومگو کے عالم میں بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ سالے نہ جانے آج کیا پروگرام بنا کے آئے ہیں پریشان ہو کے بولا۔ "اماں صاف صاف کہو بات کیا ہے۔" غازی کہنے لگا۔ "ٹینی بھائی، بات یہ ہے کہ آج ایک جگہ موقع دیکھا ہے۔" وہ آگے کہتے ہوئے جھجکنے لگا۔ باطم نے فوراً غازی کو سہارا دیا۔

"خدا قسم آج وارے نیارے ہو جائیں گے بس تم اجازت دے دو۔"

ٹینی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ مگر غازی نے اس کو کچھ کہنے ہی نہ دیا۔ جھٹ سے بولا۔ "صرف ایک دفعہ کی اجازت دے دو۔ آئندہ یہ کام ہو، تو کرنے والی کی ــ!" اس نے ایک زنانے کی گالی بکی۔ باطم نے ٹینی کے پاؤں اور بھی تیزی سے دبانے شروع کر دیئے۔ غازی نے جلدی سے دوسری بیڑی سلگا کر اس کو پیش کی۔ ٹینی الجھن میں پڑ گیا۔ ناراض بھی ہوا۔ سمجھایا بھی مگر ان کی ایک ہی رٹ تھی۔ کہ آج کے بعد وہ کبھی چوری کریں تو دونوں کو جوتے مار کے

گھر سے نکال دینا۔ پولیس کے حوالے کر دینا۔ کبھی دونوں کی صورت نہ دیکھنا۔ آخر اس کو ان کی ضد کے سامنے مجبور ہونا پڑتا۔

ٹیلنی کی رضامندی ملتے ہی غازی نے جھٹ سے ٹرنک میں سے چاقو نکالا۔ فرش پر گڑ کر اس کی دھار تیز کی اور پوری طرح تیار ہو کر بالم کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ ٹیلنی نے دیکھا اس وقت دونوں بے حد خوش نظر آ رہے تھے ان کے چہروں پر خوف کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ان کے جانے کے بعد باہر کوئی آہٹ بھی ہوتی تو وہ چونک پڑتا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے چاروں طرف خطرہ منڈلا رہا ہے۔

مگر وہ دونوں بڑے ٹھاٹھ سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ پھر انہوں نے موقع کی تلاش میں سڑک کا ایک چکر لگایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوٹھیوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک گلی میں مڑ گئے۔ اب وہ ایک دو منزلہ مکان کی پشت پر کھڑے تھے۔ ہر طرف ایک گہرا سناٹا تھا۔ کہر کے دھندلکوں نے تاریکی کا جال پھیلا رکھا تھا۔ بجلی کے کھمبے پر جلنے والا بلب، روشنی کے ایک دھبہ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

ذرا دیر تک وہ کوٹھی کی چہار دیواری کی آڑ میں کھڑے آہٹ لیتے رہے۔ پھر غازی نے کوئی دعا پڑھ کر اپنے دونوں کندھوں پر دم کی اور یا علی مدد کہہ کر بلی کی طرح قد آدم دیوار پر چڑھ کر کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گیا۔ بالم

بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ اس وقت وہاں بلا کی خاموشی تھی، درختوں کے سایوں نے تاریکی کو اور گہرا کر دیا تھا۔

سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق غازی، چاقو کو دانتوں میں داب کر پانی کے پائپ کے سہارے چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ بالم نیچے کھڑا پہرہ دے رہا تھا کہ ذرا بھی خطرہ نظر آئے تو وہ سیٹی بجا کر فوراً سگنل دے۔

کوٹھی کے پورچ کے اوپر جو کھلی چھت تھی۔ غازی ذرا دیر تک وہاں کھڑا رہا پھر وہ اس کمرے کے قریب گیا، جس کے اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے کان لگا کر آہٹ لی۔ اندر قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ مگر کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ پھر بھی اس نے اندر پہنچنے کی سبیل نکال ہی لی۔ بڑی مشکل سے وہ ایک روشن دان کے راستے کمرہ کے اندر پہنچ گیا۔ لیکن کمرے میں اس طرح داخل ہونے میں اس کا ایک کندھا بری طرح چھل گیا۔ ابھی وہ اس کی تکلیف پر غور ہی کر رہا تھا کہ کوئی چیز شور کرتی ہوئی گری۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی منہ کے بل فرش پر آ رہا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا کہ وہ ایک چھوٹی سی میز کے پاس پڑا ہے، اس کی ایک ٹانگ اس میں الجھی ہوئی ہے۔ اس نے اپنی ٹانگ نکالی ہی تھی کہ اچانک کمرے میں سہمی ہوئی آواز ابھری: "کون ہے؟" اور فوراً ہی کمرے کے اندر بجلی کا... بلب جھلکنے لگا۔

سامنے مسہری پر ایک عورت گردن اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس

کو دیکھ رہی تھی۔ فوراً ہی اس کے برابر سے ایک مرد کا چہرہ ابھرا۔ عورت نے خوف سے چیخ کر کہا۔ "چور۔ چور"۔ سناٹے میں اس کی آواز بڑی بھیانک معلوم ہوئی۔ اس کے برابر لیٹے ہوئے آدمی نے جھٹ سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور لحاف کے اندر سے نکل کر بیٹھ گیا۔ غازی نے چاقو ہاتھ میں سنبھالا اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھاگنے کے لیے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ اور برابر والے دروازے کی طرف لپکا۔ اسی وقت زینہ پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ غازی کے قدم وہیں رک گئے۔

ذرا دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ غازی نے چاقو اوپر اٹھا لیا اور دروازے کی طرف اس طرح رخ کر کے کھڑا ہو گیا کہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہو وہ اس پر حملہ کر دے۔ باہر سے آواز آئی۔

"کیا ہوا بیگم۔ کیا ڈر گئیں؟"

وہ دونوں بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ باہر سے پھر آواز آئی "دروازہ تو کھولو۔" اس دفعہ اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عورت جواب تک خاموش تھی۔ منمنا کر بولی۔ "کون ہے بھئی؟ کاہے کا شور مچا رکھا ہے۔"

وہ باہر سے بولا۔

"میں ہوں ڈارلنگ۔ تمہارے کمرے سے ابھی چیخنے کی آواز آئی تھی"

وہ کہنے لگی۔" ہاں، میں نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا"۔ سرہانے بیٹھے ہوئے شخص نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر ہاتھ کے اشارے سے باہر والے آدمی کو واپس لوٹانے کا اشارہ کیا۔ عورت فوراً ہی بولی۔" آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ جائیے اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجئے۔" مگر وہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔

" نہیں۔ نہیں اس وقت مجھ کو تمہارے پاس ہونا چاہیئے۔"

وہ ناز سے بولی۔" بھئی اللہ پریشان نہ کیجئے۔ بڑی گہری نیند آ رہی ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے بڈ سوئچ دبا کر ۔ ۔ ۔ ۔ بلب کو بجھا دیا۔ اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

جب اس کے قدموں کی آواز زینہ پر ختم ہو گئی تو غازی کے ہوش بھی ٹھکانے ہوئے۔ اب وہ ان دونوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دھندلی روشنی میں مرد سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس وقت مادرزاد برہنہ تھا۔ اور سردی سے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ غازی کو اپنی جانب گھورتے دیکھ کر وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

" کیا چاہتے ہو تم؟"

غازی آہستہ سے بولا۔" نقد زاکن"۔ اب اس کا خوف زائل ہو چکا تھا مرد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ پھر اس

نے پرس نکال کر سامنے پھینک دیا اور دھیرے سے بولا۔"بس اب چپ چاپ چلے جاؤ۔" غازی نے پلاسٹک کا خوب صورت سا بٹوہ اٹھا کر اس کو کھولا۔ اور رقم گننے لگا۔ کل ۳۶ روپے کچھ آنے تھے۔ غازی کو بڑی کوفت ہوئی۔ وہ اسی طرح جما کھڑا رہا۔ اس کی اس حرکت پر عورت نے جھنجھلا کر کہا۔

"اب کیوں کھڑے ہو؟"

غازی موقعہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ہاتھ ہلا کر مدھم لہجے میں بولا۔"اس سے کام نہیں چلے گا۔" عورت بگڑ کر کچھ اور کہنے جا رہی تھی۔ کہ مرد نے ایک بار پھر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے غازی کو بتانے لگا کہ اب اس کے پاس اور کچھ نہیں۔ غازی لمحہ بھر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ سالی حرّافہ تو خواہ مخواہ رعب جھاڑ رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ اس سے بھی جھٹکنا چاہیے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دونوں کو دیکھا اور چاقو اٹھا کر ان کی طرف بڑھا۔ مرد کی گھگھی بندھ گئی۔ حلق کے اندر سے اس کی آواز غیں غیں کر کے نکل رہی تھی۔ جیسے بلی غرا رہی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور سہمی ہوئی نظروں سے غازی کو دیکھنے لگا۔

غازی کو وہ ننگا دھڑنگا آدمی اس عالم میں بڑا ہونق سا معلوم ہوا۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کو ہنسی آ گئی۔ اس نے مرد سے تو کچھ نہیں کہا۔ البتہ عورت کو بڑی کسٹری ہوئی سی گالی دے کر دروازے پر گیا۔ بولٹ کھولا اور

باہر چھت پر آ گیا۔

نیچے آ کر اس نے دیکھا بالم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دیوار پھاند کر جب وہ سڑک پر پہنچا تو وہ وہاں بھی نہ تھا۔ اس نے کئی بار حلق سے اپنی مخصوص آواز نکالی۔ مگر اس کے سگنل کا کوئی جواب نہ ملا۔ آخر جب وہ شاہین ٹلینی کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بالم خوف زدہ سا وہاں بیٹھا تھا۔ اس کو وہاں دیکھتے ہی غازی بگڑ کر بولا۔

"سالے خاں تم یہاں بیٹھے ہو اور میں وہاں ڈھونڈ رہا تھا"

بالم کھسیانا ہو کر کہنے لگا "یار جیسے ہی جگار ہوئی میں نے تم کو سیٹی دی، مگر تمہارا کہیں پتہ نہ تھا" ٹلینی بیچ میں بول اٹھا "میں تو یہ سمجھا تھا کہ آج تم دھر لئے گئے اور مجھ کو بھی حوالات دیکھنا پڑے گی" غازی ہنس کر بولا۔

"اماں کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوتے ہیں مگر یار کچھ کام بنا نہیں" اس نے پرس نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا "آج تو وہ مزا آیا کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ یار ایسے موقع سے پہنچا کہ" اس کے بعد وہ ساری تفصیلات مزا لے لے کر سنانے لگا۔ بالم اور ٹلینی بار بار ہنس پڑتے۔

اس روز وہ افطاری کے وقت سوئے اور دن چڑھے تک پڑے سوتے رہے۔ اتوار کا دن تھا۔ اس لیے ٹلینی کو بھی کارخانے جانا نہیں تھا۔ اور وہ دونوں تو بہت دنوں سے چھٹی پر تھے۔

سب سے پہلے غازی کی آنکھ کھلی وہ دونوں کو سوتا چھوڑ کر سیدھا حلوائی کی

دوکان پر گیا۔ وہاں سے گرم گرم پوریاں لے آیا۔ باطم اور ٹینی ابھی تک سو رہے تھے۔ اس نے دونوں کو جگایا۔ سب نے مل کر پوریاں کھائیں۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگائے اور زور زور سے قہقہے لگائے۔ اس روز وہ بڑے مگن تھے غازی کا پروگرام تھا کہ شام کو سینما دیکھا جائے مگر ٹینی نے اس کی مخالفت کی اور کہنے لگا۔

"تم ساری رقم اسی طرح خرچ کر دو گے۔ تم کو تو حرام خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ کوئی ایسا سبیتا نکالا جائے کہ کوئی ڈھنگ کا دھندا چلے۔"

غازی مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "اتنی سی رقم سے بھلا کیا دھندا شروع کیا جا سکتا ہے۔"

باطم نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اماں ٹینی بھائی ۳۰، ۲۵ روپے سے بھی کوئی کام شروع کیا جا سکتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگا۔ "یار آج فلم کا پروگرام ہو ہی جائے، بہت دن ہو گئے۔ سالی کوئی فلم ہی نہیں دیکھی۔" ٹینی کے آگ ہی تو لگ گئی۔ پہلے تو اس نے دونوں کو خوب ڈانٹا۔ پھر بڑے سرپرستانہ انداز میں دونوں کو سمجھاتا رہا۔ آخر یہ طے ہوا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کیا جائے۔ اب سوچنا یہ رہ گیا تھا کہ کس قسم کا دھندا شروع کیا جائے۔ کئی اسکیمیں سامنے آئیں مگر ان پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

بالم جواب تک خاموش بیٹھا تھا چٹکی بجا کر بولا۔

"یار سینما کے ٹکٹوں کی بلیک کیسی رہے گی۔ مزے سے دونوں مل کر ۴، ۵ روپے روزانہ پیدا کر لیا کریں گے۔ اور سینما چوکٹ میں دیکھنے میں آئے گا۔ کہو استاد کیسی کہی۔"

وہ داد طلب نگاہوں سے دونوں کی جانب دیکھنے لگا۔ غازی نے گالی دے کر کہا "یہ سالا تو ایسی ہی سوچتا ہے۔ ابے یہاں ایک سے ایک بڑا مکرانی پڑا ہے۔ سالے ان کی دادا گیری کے سامنے تمہاری کیا دال گلے گی۔ پھر پولس کے ڈنڈے الگ کھاؤ۔ ایسا ہی دھندا کرنا ہے تو کوکین کا کاروبار کرو۔ جس میں رقم بھی اچھی ہاتھ لگے ٹکٹوں کی بلیک میں تو ہر وقت جوتالات رہے گا۔" ٹیپی کو یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ کہنے لگا۔

"تم دونوں کا تو ایمان خراب ہو گیا ہے۔ جب سوچو گے ہے ایمانی اور اٹھائی گیری پن کی بات۔" پھر اس نے خود ہی فیصلہ دے دیا "میرے ساتھ رہو گے تو یہ چار سو بیس نہیں چلے گی۔ تم دونوں آج ہی جا کر ایک ایک ٹوکری خریدو اور ایمپریس مارکٹ سے انڈا مکھن اور ڈبل روٹی لے کر، کل صبح سے پھیری لگانا شروع کرو۔ روپیہ، دھیلی روز بچ ہی جایا کرے گا۔ کچھ رقم پلے ہو جائے تو کوئی اور دھندا بتاؤں گا۔"

دونوں نے حیل و حجت کرنا چاہی تو اس نے ان کو ڈانٹ دیا۔ لہٰذا دونوں

اسی ارادے سے بازار چل دیئے۔ ان کے جانے کے بعد ٹلینی پھر پڑ کر سو گیا۔ شام کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ دونوں ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ وہ گھر میں بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے کوئی ۹ بجے دونوں واپس لوٹے۔ مگر آپس میں گالی گلوج کرتے ہوئے۔ غازی نے آتے ہی بالم کی شکایت کا دفتر کھول دیا۔

"ٹلینی بھائی، اس سالے نے تو آج اپنا گلا کٹوا دیا۔ یہ دیکھو کل ۹ آنے پوری رقم میں سے باقی بچے ہیں۔"

وہ جیب سے ریزگاری نکال کر دکھانے لگا۔ ٹلینی کو دکھ بھی ہوا، اور غصہ بھی آیا۔ پوچھنے لگا۔ "آخر ہوا کیا۔" غازی بتانے لگا۔ "وہاں میں تو انڈے خریدنے جا رہا تھا۔ اس سالے کا ایک یار مل گیا۔ اس نے ایسی پٹی پڑھائی کہ یہ بھی اندھا ہو گیا۔ ریلوے کے پارسلوں کا نیلام تھا۔ آج وہی جو بچ بچا جاتے ہیں، جن کا کوئی چھڑانے والا نہیں ہوتا۔ زبردستی مجھ سے ایک پارسل پر بولی لگوا دی۔ ۸ روپے پر بولی چھوٹی۔ اندر سے نکلا کیا۔ گوڈر اور پتھر کے ٹکڑے ریلوے والوں نے اصل مال پہلے ہی پار کر دیا تھا۔"

بالم جواب تک مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا ایک بارگی تڑپ کر بولا۔ "اب یہ پوچھو کہ باقی رقم کہاں گئی؟" اس نے غازی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب یہ بھی کہہ دو کہ ریس چلنے کے لیے بھی میں نے ہی کہا تھا۔"

غازی کے بالوں کو کریدنے لگا۔" اماں میں نے تو سوچا تھا کہ چلو یہاں تقدیر نے دھوکا دیا۔ شاید ریس میں قسمت لڑ جائے۔ پر سالا آج دن ہی کچھ منحوس تھا۔" ٹیلنی خاموش بیٹھا رہا۔ وہ دونوں دیر تک اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیر تک ٹیلنی کچھ نہ بولا۔ تو دونوں نے اس کی خوشامد شروع کردی۔ بالم پیر دبانے کے لیے بار بار ہاتھ بڑھاتا اور ٹیلنی اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔ غازی نے بیڑی سلگا کر دی۔ تو اس کو لینے سے بھی انکار کر دیا۔ کئی منٹ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر ٹیلنی جل کر ان کو گالیاں دینے لگا۔ دونوں بے غیرتی سے دانت نکالے ہنستے رہے۔

اب پھر دونوں پیسہ پیسہ کو محتاج ہو چکے تھے۔ بات بات پر آپس میں جھگڑا کرتے۔ ٹیلنی کی خوشامد کرتے اور سویرے ہی سویرے کام دھندے کی تلاش میں گھر سے نکل جاتے۔ انہی دنوں ایک روز ٹیلنی نے کارخانے سے واپس آکر یہ بری خبر سنائی کہ اس کا کام بھی چھوٹ گیا۔ سیٹھ نے کارخانہ بند کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کو اس سال حکومت نے امپورٹ لائسنس نہیں دیا تھا۔

بے روزگاری کے دنوں میں ٹیلنی بھی بدلنا شروع ہو گیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتا۔ گالیاں بکنے لگتا۔ اس کی طبیعت میں برابر چڑچڑا پن آتا جا رہا تھا بالم اور غازی ہر وقت سہمے ہوئے رہتے۔ اس کی تیوری پر بل دیکھتے تو چپکے سے باہر نکل جاتے۔ اب وہ اس سے ڈرنے لگے تھے۔

وہ دونوں تو پہلے ہی سے پھکڑ تھے۔ اب ٹیلنی کی حالت بھی انہی کی سی ہو گئی تھی۔ کئی کئی وقت بغیر کچھ کھائے گزر جاتے۔ تینوں مل جل کر گھنٹوں نئی نئی اسکیمیں سوچتے۔ دن دن بھر دوڑ دھوپ کرتے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے، ٹیلنی رات بھر کا بھوکا تھا۔ صبح اٹھا تو نہ چائے تھی نہ بیڑی۔ رات نیند اس کو یوں ہی کم آئی تھی۔ مزاج چڑچڑا ہو رہا تھا۔ کمرے میں اس وقت صرف بالم موجود تھا۔ غازی سویرے ہی سویرے کہیں نکل گیا تھا۔ ٹیلنی نے منہ ہاتھ دھونے کے لئے لوٹا لے کر گھڑے سے پانی نکالنا چاہا تو وہ بالکل خالی پڑا تھا وہ جھنجھلا کر بالم سے بولا۔

"تم لوگ تو سالے لاٹ صاحب ہو۔ کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مٹکے میں پانی بھر لیا ہوتا۔ میں کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ ہر کام میں کروں۔"

بالم نے دیکھا کہ صبح ہی صبح نزلہ ادھر گر رہا ہے۔ اس نے جھٹ سے غازی کو ڈھال بنایا۔ کہنے لگا۔ "میں نے تو کل پانی بھر دیا تھا معلوم ہوتا ہے غازی صبح اٹھ کر نہایا ہے۔ یہ دیکھو دروازے کے باہر کیچڑ ہو رہی ہے۔"

ٹیلنی نے غازی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس وقت اتفاق سے وہ بھی آ گیا۔ پہلے غصہ ہی کیا کم تھا۔ کہ اس بات پر اور بھی آگ لگ گئی کہ وہ اس کی خاکی پتلون بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے آتے ہی چیخ کر بولا۔

"کیوں جی یہ پتلون تم نے کس کی اجازت سے پہنی۔ تمہارے باپ نے

بنوا کر رکھ دی تھی کہ جب چاہا پہنا اور سالے نواب بن کر چل دیئے۔"

غازی شکایت کرنے کے سے لہجہ میں بولا۔" دیکھو جی ٹیلنی تم ذرا ذرا سی بات پر باپ دادا پر پہنچ جاتے ہو۔" پھر اس نے غصہ سے اس کی پتلون اتار کر پھینک دی۔ اور اپنی شلوار پہنتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔" شلوار پھٹی ہوئی تھی۔ سالا بدن تک ننگا نظر آتا ہے۔ ایک جگہ کام ملنے کی امید پر گیا تھا۔ ذرا سی پتلون پہن لی تو آفت مچا دی۔"

ٹیلنی اسی طرح بولا۔" ہم نے ہزار دفعہ کہا کہ ہماری چیزیں مت چھوا کرو۔ تم تو بے غیرت ہو بے غیرت۔" اور پھر اس نے غصہ سے اٹھ کر پتلون کی موریاں پکڑ کر چھر چھر کر کے اس کو پھاڑ ڈالا۔

کمرے کی فضا بڑی مکدر ہو گئی تھی۔ ٹیلنی زور زور سے اس کو گالیاں دے رہا تھا بالم بھی کبھی کبھی اس کی حمایت میں تائید کرتا جا رہا تھا۔ غازی اس وقت ٹیلنی سے تو کچھ نہیں کہہ سکا البتہ بالم پر برس پڑا۔ ٹیلنی کو اس بات پر اور بھی تاؤ آیا۔ اس سے کہنے لگا۔

"ابے اس کے سر کیوں ہو رہا ہے۔ مجھ سے کہہ دادا گیری دکھاتا ہے تو کہیں اور جا کر دکھاؤ۔ یہاں یہ نہیں چلے گی۔ بس ہو چکی یاری۔ بڑھاؤ اپنا ٹٹو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

غازی نے زبان سے تو ایک لفظ نہیں نکالا۔ جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس زور سے اس کو دھکا دیا کہ وہ فرش پر دور تک لوٹتا چلا گیا۔ ٹیلنی فوراً اٹھ کر

کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ گلا پھاڑ کر چیخا۔

"ابھی نکل جا سالے، اُلّو کے پٹھے"۔

غازی تیزی سے دروازے کے باہر نکل گیا۔ بالم لمحہ بھر تک تو خاموش کھڑا رہا۔ پھر بھی وہ باہر چلا گیا۔ ٹینی کو ان کے اس طرح چلے جانے پر حیرت تو ہوئی۔ مگر اس نے بالم کو روکنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔

دونوں کے جانے کے بعد وہ تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ کمرے کے اندر ویرانی سی برس رہی تھی۔ سورج اب چڑھ کر سر پر آ گیا تھا۔ مگر وہ اسی طرح بے سدھ پڑا رہا۔ پھر سہ پہر ہوئی۔ شام ہو گئی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا، اب وہ دونوں یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔

جب اندھیرا بڑھنے لگا۔ تو اس کو خیال آیا کہ اس طرح گھر میں پڑے پڑے کس طرح کام چلے گا۔ کئی وقت کے فاقہ نے اس کو بیماروں کی طرح نحیف و نزار بنا دیا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے اٹھا اور یہ طے کر کے گھر سے باہر نکلا کہ آج وہ کوئی نہ کوئی کام کی صورت نکال کر واپس لوٹے گا۔ کہیں دور جانے کی ہمت نہ تھی، لہٰذا اس نے سوچا۔ کہ آخر خداداد کالونی میں بھی اتنی بہت سی جو شاندار کوٹھیاں بنی ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو اس کو کام کاج مل ہی جائے گا۔ اب وہ برتن مانجھنے سے لے کر ہر کام کرنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔

سڑک پر آکر اس نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ کس کے پاس جائے سوچتے سوچتے اس کو حاجی صاحب کا خیال آگیا۔ ان کی کوٹھی کے نوکروں سے اس کی جان پہچان تھی۔ اس لیے اکثر وہاں آیا جایا کرتا تھا۔ اس طرح حاجی صاحب کو بھی کبھی کبھار سلام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ سیدھا ان کے یہاں پہنچا اتفاق سے حاجی صاحب کوٹھی کے لان میں ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ وہ ان کو سلام کرکے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔
"سرکار کام کاج چھوٹ گیا ہے۔ بہت دن سے بے روزگار ہوں دو وقت کے کھانا کا سہارا ہو جائے۔ تو آپ ہی کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔"

وہ اظہار افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے "بھئی مجھ کو فی الحال کسی آدمی کی ضرورت نہیں، اکرم میاں کو ایک اردلی کی پچھلے دنوں ضرورت تھی مگر اب تو انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔ وہ تو نہیں چاہتا تھا۔ ماں نے زور دیا کہ میرا بیٹا دفتر کے کاموں سے دبلا پڑ گیا ہے۔ میں پانچ سو روپلی کے لیے اس کی صحت غارت نہیں ہونے دوں گی تم جانو ماں کی ممتا، اکرم کو نوکری چھوڑنا ہی پڑی۔ اب تو وہ آئندہ مہینہ امریکہ پڑھنے جا رہے ہیں۔"

ٹیلی نے سوچا یہ شخص تو نہ معلوم کب تک اپنے بیٹے کی کتھا سناتا رہے گا۔ ایسی باتیں جن سے اس کو کوئی واسطہ نہ تھا، لہذا اس نے ہمت کرکے ان کی بات کاٹ دی۔

"اچھا سرکار تو پھر کسی اور وقت آؤں گا۔ ابھی ایک جگہ اور جانا ہے۔"

وہ ان سے اجازت لے کر بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا۔ یہاں پانچ ٹکے کا سہارا نہیں، یہ سالا بتا رہا ہے کہ پانچ سو روپے میں میرے بیٹے کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے، واہ اللہ میاں خوب ہے تمہارا انصاف۔

وہ اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ اندھیرے میں کسی سے ٹکرا گیا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا کہ ایک ننگ دھڑنگ بچہ کھڑا منہ بسور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کٹورا تھا جو زمین پر گر پڑا تھا۔ بچہ دیر تک منہ بسورتا رہا۔ پھر ایک بار زور سے چلا کر رونے لگا۔ سامنے جھونپڑی میں سے ایک عورت چیخی "ارے کیا ہو گیا۔ حرامی تو منہ سے تو بول، روئے کیوں جا رہا ہے۔" ٹینی نے سوچا۔ عورت بڑی تیز معلوم ہوتی ہے۔ بلا کی طرح پیچھے پڑ جائے گی۔ وہ گھبرا کر پرا بر والی سڑک پر مڑ کر ایک خوب صورت سی کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک بڑا سا کتا نکل کر اس پہ جھپٹا۔ ٹینی گھبرا کر چیخ اٹھا۔ فوراً ہی کوٹھی کے برانڈے میں سے کسی نے آواز دی۔

"روبی۔ روبی، ادھر آؤ۔"

کتا دم ہلاتا ہوا اس کے قدموں پر جا کر لوٹنے لگا۔ اس آدمی نے وہیں سے پوچھا "تم کو کس سے ملنا ہے؟" ٹینی چپ چاپ اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے دس بارہ سال کا ایک بچہ نکلا

اور اس شخص سے کہنے لگا۔

"پاپا، نیلی کھانا نہیں کھاتی۔ خوب شور مچا رہی ہے۔"

اسی اثنا میں وہاں ایک بڑی پیاری سی بچی منہ بسورتی ہوئی آگئی۔ وہ پوچھنے لگا "نیلو بیٹا کیا بات ہے۔" بچی سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔

"وہیں لے چلو پاپا، جہاں کل کھانا کھایا تھا۔ ہم یہاں نہیں کھائیں گے۔"

اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ اور اس کو چمکارنے لگا۔ "ہوٹل چلے گی بیٹی اپنی نیلو کو لے کر ابھی چلوں گا۔" اس نے ڈرائیور کو آواز دی۔ "ڈرائیور گاڑی نکالو ہم باہر جائیں گے۔" اس نے ٹیپی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ بچی کو گود میں لیے ہوئے اندر چلا گیا۔ اب وہاں کھڑا رہنا بے کار تھا۔ اور سب سے زیادہ اس بڑے بڑے بالوں والے خوف ناک کتے کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کوٹھی سے باہر آ گیا۔ وہاں سے وہ دل برداشتہ لوٹا۔ اس کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ واپس گھر چلا جائے۔ لیکن بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا اس نے سوچا۔ گھر جا کر بھی وہ کیا کرے گا۔ چلو ایک آدھ جگہ اور کوشش کر دیکھوں شاید کہیں قسمت لڑ جائے۔ واپس تو بہر حال جانا ہی ہے۔ اس خیال سے ذرا ڈھارس بندھی۔ تو وہ ڈرتا ڈرتا ایک اور کوٹھی پر پہنچا۔ پھاٹک ہی سے اس نے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں آس پاس کوئی کتا تو نہیں ہے مگر میدان صاف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا مگر وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ چپ چاپ

کھڑا رہا۔ جب زیادہ دیر ہو گئی تو اس نے سوچا کہ پتہ نہیں کوئی اس طرح مجھ کو یہاں کھڑا دیکھ کر کیا سوچے۔ لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں کوٹھی کے اندر سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی نکل کر آیا۔ دیکھنے میں خانساماں معلوم ہوتا تھا ٹیلی نے آہستہ سے پوچھا۔

"صاحب اندر ہیں؟"

وہ آدمی بولا۔ "ہاں اندر ہی ہیں" پھر وہ نکڑ والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "بیٹھے ہیں جا کر مل لو۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ ٹیلی نے جھجکتے ہوئے جا کر کمرے کا پردہ سرکایا اور دہلیز پر ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

"کون ہے۔ اندر آ جاؤ۔ وہاں کیوں کھڑے ہو۔"

وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ وہ بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ مونچھیں داڑھی صفاچٹ۔ سر چندلا۔ آنکھوں پر چوڑے فریم کا چشمہ۔ وہ اس وقت کوئی انگریزی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ٹیلی سے پوچھنے لگا۔

"کیوں بھئی۔ کیا کام ہے۔"

اس کا لہجہ بڑا نرم تھا۔ ٹیلی کو ڈھارس بندھی۔ جھٹ سے اپنا دکھڑا سنا ڈالا۔ وہ خاموشی سے ٹیلی کی باتیں سنتا رہا۔ ٹیلی اپنی بات ختم بھی کرنے نہیں پایا تھا کہ اتنے میں ملازم نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔ ذرا ہی دیر بعد

ڈاکٹر ایک موٹی تگڑی عورت کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ وہ عورت ڈاکٹر سے کہنے لگی۔

"دیکھئے ڈاکٹر صاحب! ان کی گردن پر آج صبح سے یہ سُرخ نشان نظر آرہا ہے۔ یہ برابر اس بات پر مصر ہیں کہ مچھر کے کاٹنے کا نشان ہے۔ ان کو اپنی صحت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ ذرا دیکھئے تو کیسا لال لال ہو رہا ہے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔"

وہ آدمی بولا۔ "ڈاکٹر صاحب ان کو تو یونہی وہم ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس کی گردن کا اچھی طرح معائنہ کیا اور ایک کاغذ پر نسخہ لکھ کر بولا۔ "بازار سے یہ مرہم منگوا لیجئے۔ سوتے وقت لگا لیجئے گا میرا خیال ہے۔ اس سے یہ داغ مٹ جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک ٹھیک نہیں ہوا تو انجکشن دے دوں گا۔"

ساری ہدایات دے کر اس نے اپنا بیگ سنبھالا۔ اور چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ عورت نے اپنا پرس کھولا اور ڈاکٹر کو فیس کے ۳۰ روپے دے دیئے۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ عورت وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے ایک بارگی اس کی نظر ٹینی پر پڑ گئی۔

پوچھنے لگی۔ "یہ کون ہے؟"

اس کا خاوند بولا۔ "بے چارہ پریشان ہے۔ ملازمت چاہتا ہے۔"

وہ اس پر بگڑ کر بولی۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے پاس یونہی زیادہ آدمی

ہیں۔ مگر آپ کو اس سے کیا غرض، جو آیا۔ اس کو رکھ لیا۔ پوری پلٹن کی پلٹن ہو گئی۔ اور سب حرام خور اور نکمے ہیں۔" پھر وہ ٹلینی سے بولی "نا بابا، ہم کو کوئی آدمی نہیں چاہیئے۔" مگر ٹلینی وہاں سے ہٹا نہیں۔ گردن جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا "کام کاج نہیں مل سکتا تو آپ دس بیس روپے سے مدد کر دیجئے۔ اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے۔ میں اس سے کوئی چھوٹا موٹا دھندا۔۔۔!"

عورت نے اس کی بات پوری سنی بھی نہیں۔ گرج کر بولی "لو اور سنو یہاں کوئی خیرات بٹتی ہے کہ آؤ، پیرو، لے جاؤ" ٹلینی نے سوچا اب جو یہاں ٹھہرا تو یہ حرام زادی نوکر کو بلوا کر نکلوا دے گی۔ اس نے بڑی خونخوار نظروں سے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کمرے کے باہر آ گیا۔

سڑک پر آ کر اس کو ایک بارگی بالم اور غازی یاد آ گئے۔ ان کی یاد کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ پھاٹک پر چوکیدار ابھی نہیں تھا۔ کتا بھی ان کے پاس نہیں تھا۔ کوٹھی کی چھت پر نیم کا ایک گھنا پیڑ جھکا ہوا تھا۔ موقع اچھا تھا۔ وہ شکاری کی سی تیز نظروں سے اس طرف یک لخت گھورتا رہا۔ پھر خود ہی چونک پڑا "نہیں جی، یہ ٹھیک نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں میرا امتحان لے رہے ہیں۔ یہ تو آزمائش ہے۔ آزمائش۔" اس نے اپنے گالوں پر کس کس کے دو طمانچے لگائے اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

وہاں جا کر دیکھا کہ تو دروازہ کھلا تھا اور اندر روشنی ہو رہی تھی۔ گھبرایا ہوا اندر گیا تو دیکھا کہ غازی اور بالم وہاں موجود تھے۔ اس کو دیکھتے ہی دونوں نے کان پکڑ کر گردن جھکالی۔ اس حالت میں وہ سرکس کے مسخروں کی طرح نظر آ رہے تھے ٹینی کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پوچھنے لگا۔

"تم دونوں دن بھر کہاں رہے؟"

بالم بولا "بات بعد میں ہو گی۔ پہلے کچھ کھا لو۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ بس اب آ جاؤ" اتنا کہہ کر اس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی مرغ بال اور کباب نکال کر سامنے رکھ دیئے۔ غازی کہنے لگا۔

"صبح سے ایک دانہ بھی حلق میں گیا ہو تو سور کھایا ہو۔"

اس نے ٹینی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور تینوں کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک شکوے و شکایت ہوتی رہی پھر انہوں نے اس موضوع پر بحث چھیڑ دی کہ اب کیا کیا جائے۔ باتوں باتوں میں بالم نے یہ مشورہ دیا کہ اس مکان کو پگڑی پر اٹھا دیا جائے۔ ایک آدمی کئی دن سے اس کے لیے کہہ رہا ہے۔ چار سو ٹنک دے دے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس سے کوئی کام شروع کیا جائے۔ لیکن ٹینی اس کے لیے آمادہ نہ ہوا کہنے لگا۔

"یہ بھی سوچا کہ پھر رہو گے کہاں؟"

بالم بولا۔ اماں کہیں پڑ رہیں گے۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ کام چل گیا تو کہیں رہنے کا بھی ٹھکانہ ہو جائے گا۔ یوں کب تک بھوکے مریں گے۔"

ٹینی پھر بھی نہ مانا تو غازی بولا۔

"تو پھر کہو تو ایک دن پھر قسمت آزما لیں۔ ہیں۔ نئے کئی جگہ موقع لگایا ہے خدا قسم داؤں پڑ گیا تو اب کی ٹھاٹھ ہو جائیں گے۔ بولو کیا کہتے ہو۔"

ٹینی بگڑ کر گالیاں بکنے لگا۔ جب ذرا اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو ان دونوں نے پھر یہی سوال دہرایا کہ آخر اب کیا کیا جائے۔ بڑی حیل و حجت کے بعد ٹینی اس بات پر رضامند ہو گیا کہ پرسوں تک ملازمت کی تلاش کرتے ہیں۔ اگر کام مل گیا تو مکان پگڑی پر دے کر اس رقم سے کاروبار کیا جائے۔

سویرے اٹھ کر تینوں پھر کام کاج کی تلاش ہی نکل گئے۔ سب سے پہلے ٹینی واپس لوٹا تو اس نے دیکھا کہ پاس پڑوس کے گھروں میں بڑی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس پوری عمارت کو برابر والی کوٹھی والے خان بہادر صاحب نے الاٹ کرا لیا ہے۔ اور اس میں ان کا داماد اور لڑکی رہے گی۔ کل ایک ہفتہ کی مہلت ملی ہے۔ اس کے بعد پولس آکر خالی کرا لے گی۔ یہ سن کر ٹینی بھی پریشان ہو گیا۔ وہ دونوں آئے، ان کو بھی یہ خبر ملی تو وہ بھی گھبرا گئے۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے۔ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی

تھی روزانہ رات کو سارے گھروں کے لوگ اکٹھا ہوتے۔ رات گئے تک باتیں ہوتیں کہ کیا کیا جائے۔ ٹینی نے سب کو اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ چاہے پولس آئے، چاہے فوج، وہ اس کو خالی نہیں کریں گے۔ وہ اونچی آواز میں گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا۔ "اجی اس کو خالی کرا لینا مذاق نہیں ہے۔ ہم نے تو سالے بڑے بڑے کارخانہ داروں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ پچھلے دنوں ایک آدمی کو نکالا تھا۔ سب نے ہڑتال کر دی۔ وہیں دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ پولس بھی آئی۔ دھونس دھپا بھی دیا گیا۔ پر وہی ہوا جو ہم نے چاہا۔ یہ تو مکان کا معاملہ ہے۔ اتنے سارے لوگ جم کر سامنے آ گئے تو کس مائی کے لال کی ہمت کہ یہاں سے ہم کو نکال دے۔" اس کی باتوں سے لوگوں کی خاصی ہمت بندھ گئی تھی۔ آخر یہی طے کیا گیا کہ وہ کسی قیمت پر اس جگہ کو خالی نہیں کریں گے۔

نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی خان بہادر کے چند آدمی اور کچھ پولس والے آئے لوگوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو تکتے جھکتے چلے گئے۔ اس کے بعد مدت تک کسی نے ادھر لوٹ کر پوچھا بھی نہیں۔ لوگ پھر اطمینان سے رہنے لگے۔

تینوں میں سے کسی کو آج تک کوئی کام کاج نہیں ملا تھا۔ البتہ غازی کا ایک ملنے والا بیمار پڑ گیا تھا۔ وہ اس کی رکشا لے کر چلانے لگا تھا۔ اس سے جو کچھ مل جاتا تینوں پیٹ بھر لیتے۔ مکان پگڑی پر اٹھانے کی بات چیت پھر شروع ہو گئی تھی۔ پچھلے دنوں تو کوئی اس ڈر سے آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ کہیں خالی نہ کرنا پڑے۔ ایک روز غازی کہیں سے سینما کا پاس لے آیا۔ تینوں فلم دیکھ کر کوئی بارہ بجے

لوٹے تو انہوں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ گیس بتی جل رہی تھی لوگ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے بچے زور زور سے رو رہے تھے تینوں گھبرائے ہوئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ پولس کی بہت بڑی جمعیت وہاں موجود تھی۔ سڑک کے ایک طرف سامان کا جگہ جگہ ڈھیر لگا تھا۔ پوری عمارت پولس نے خالی کرائی تھی۔ عورتیں رو رو کر پوری داستان سنا رہی تھیں کہ کس طرح گھروں میں گھس گھس کر ان کو زبردستی کھینچ کر نکالا گیا۔ کیوں کر ان کا سامان اٹھا اٹھا کر باہر ڈالا گیا۔ مرد خاموش تھے۔ ان میں سے کچھ کو پولس پکڑ کے تھانے لے گئی تھی۔ ان پر بلوہ کرنے کا الزام تھا۔

غازی اور باطم یہ حالت دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ گالیاں بکنے لگے۔ مگر ٹینی نے ان کو روک دیا اور دونوں کو ساتھ لے کر اپنا سامان تلاش کرنے لگا۔ بڑی دیر تک ڈھونڈھنے کے بعد کچھ سامان ملا۔

وہ رات انہوں نے سامنے میدان میں بسر کی۔ سردی ختم ہو چکی تھی مگر رات بھر اس شدت کی اوس گری کہ وہ بھیگ کر رہ گئے۔ سویرے اٹھے تو ہر ایک کا بدن دکھ رہا تھا۔ خان بہادر نے سب کی ایسی حالت دیکھی تو بنگلہ کے ایک طرف جو سائبان پڑا تھا اس کو میدان میں لگوا دیا۔ اس سائبان میں کبھی ان کا گھوڑا بندھا کرتا تھا۔ وہ گھوڑا جو ہر ریس میں ہارا کرتا تھا اور جس کو جل کر انہوں نے گولی مار کر خود ہی ختم کر دیا تھا۔

دوسرے ہی دن سے اس ادھوری عمارت کو توڑ پھوڑ کر نئی عمارت کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ بالم اور غازی اس طرف دیکھتے تو خان بہادر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے رشتے جوڑتے کہ اگر وہ سن پاتا۔ تو ان کو عمارت کی دیوار سے چنوا دیتا۔ البتہ ٹینی خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہتا۔ اب اس نے ہنسنا بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت گم سم سا رہتا۔ نوکری کی تلاش بھی چھوڑ دی تھی۔ ہر وقت سائبان کے نیچے پڑا رہتا۔ اس کی صحت گرنے لگی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں کے اندر ہر وقت وحشت نظر آتی۔

آخر ایک روز اس کھنڈر نما عمارات کے اندر سے ایک بڑی شاندار کوٹھی ابھر کر سامنے آ گئی اس کی رنگین دیواریں جھلملانے لگیں اور دریچوں پر ریشمی پردے لہرانے لگے۔ رات کو بڑا زبردست جشن ہوا۔ بڑی شاندار دعوت ہوئی۔ بڑے بڑے سرکاری حکّام اور لیڈر آئے۔ سامنے میدان میں ہر طرف موٹریں ہی موٹریں نظر آتی تھیں۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ رہا۔

رات کے پچھلے پہر غازی کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ٹینی نے اس کے سرہانے سے چاقو نکال لیا ہے اور خاموش کھڑا انگلی پھیر کر اس کی دھار دیکھ رہا ہے۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ بڑا پر اسرار نظر آ رہا تھا۔ غازی دم سادھے پڑا دیکھتا رہا اور دیر بعد ٹینی آہستہ آہستہ چلتا باہر چلا گیا

جب وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا تو اس نے بالم کو جگا دیا اور ساری بات

بتائی ۔ دونوں نے سوچا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹلینی آج کہیں موقع سے گیا ہے۔ بالم کہنے لگا۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ سالی چوری کی ایسی چاٹ ہے کہ ایک دفعہ اس کا چسکہ لگ جائے تو پھر کہیں چھٹتی ہے۔"

غازی بولا" ہاں جی، بھلا کہیں ایمان داری سے کام چلتا ہے آج کل۔ سالا خواہ مخواہ بڑا اللاں بنا گھومتا تھا۔ اپنا تو کباڑا کرا دیا۔ یار یہاں کی دھوپ میں رکشا چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اماں سر بھن کے رہ جاتا ہے۔"

وہ دونوں دیر تک پڑے پڑے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ دونوں کو اس کے واپس آنے کا انتظار تھا۔ صبح کی سفیدی پھیلنے سے پہلے ان کو سڑک پر ٹلینی نظر آیا، وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ ان کے سامنے تھا۔ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ غازی بولا۔

"اماں کہاں گئے تھے؟"

ٹلینی بولا" شی" دونوں نے دھندلی روشنی میں دیکھا اس کے ہاتھ میں خون سے بھرا ہوا چاقو تھا۔ جس سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ دونوں کانپ اٹھے اس نے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک بنڈل ان کے سامنے ڈال دیا۔ اور آہستہ سے بولا" پورے دس ہزار ہیں، سالو اس کو لے کر بھاگ جاؤ میں نے تو وہاں سب کا صفایا کر دیا۔ پانچوں کے پانچوں ٹھکانے لگا دیئے، سب کو قتل کر دیا، ایک

ایک کو!" وہ شرابی کی طرح جھوم جھوم کر بول رہا تھا۔ پھر اسی عالم میں بگڑ کر بولا۔

"ابے اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جاؤ نکل جاؤ۔"

غازی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اور تم؟"

ٹینی ہنس دیا۔ "ہیں! میں تو سیدھا تھانے جا رہا ہوں۔"

بالم جھٹ سے بولا۔ "نہیں ٹینی بھائی یہ نہیں ہو سکتا۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" وہ بگڑ کر بولا۔

"بڑا آیا سالا میرا ہمدرد۔ ابے جاتے ہو کہ نہیں۔"

اس نے دونوں کے سامنے جھٹ سے چاقو کر دیا۔ دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ غازی کچھ کہنے کے لیے ٹھٹکا تو ٹینی نے زور سے گالی دی۔ "جا تیری ———!" اور وہ ان کی طرف لپکا۔ دونوں بنڈل سنبھالی کر سہمے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ دور جا کر وہ ٹھہر گئے۔ انہوں نے دیکھا، ٹینی خون آلود چاقو لیے، شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سامنے سڑک پہ جا رہا تھا۔ صبح کاذب کی ہلکی سفید روشنی میں، وہ کسی کبڑے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

○

# خلیفہ جی

آخری آدمی جو اس کی میز سے اٹھ کر گیا تھا، وہ ساتواں دلّال تھا۔ اب رات کے دس بجنے والے تھے۔ ایرانی ہوٹل کا ہنگامہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ ہال کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر گھروں کو جانے لگے تھے۔ میزیں رفتہ رفتہ خالی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن محکمہ اطلاعات کا اپر ڈویژن کلرک عتیق اللہ خاموش بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ اس نے چائے کی پانچویں پیالی ختم کر کے دوسرے پیکٹ کا آخری سگریٹ سلگایا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ذرا ہی دیر۔۔۔ بعد ایک آدمی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ عتیق اللہ نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اسی طرح فکرمند بیٹھا رہا۔ آخر نووارد نے سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ سے کہا۔

5124

"فسٹ کلاس فلیٹ ہے، لینگا؟"

اس دفعہ عتیق اللہ نے اس کی جانب گہری نظروں سے دیکھا اور گردن ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ آدمی کہنے لگا۔ "دیکھو سیٹھ، ہم بوم نہیں مارتا۔ جو بات ہے صاف صاف ہے۔ دو کمرے، ایک بڑا ہے، ایک ذرا چھوٹا، ونسٹ اوپن (WEST OPEN) پگڑی صرف دو ہزار، ۵۰ روپیہ دلالی کا، ابھی چل کر دیکھ سکتے ہو۔ کراچی کے اندر اتنا سستا فلیٹ نہیں ملینگا سیٹھ!" وہ خالص دلالوں کے لہجہ میں اپنی بات کہتا رہا۔ اور عتیق اللہ گم سم بیٹھا، دل ہی دل میں ایک بار پھر جیب کے اندر پڑے ہوئے روپوں کو گننے لگا۔ اب تو ۲۲۰ سے بھی کم رقم رہ گئی تھی۔

اس کو خاموش دیکھ کر دلال نے پوچھا۔ "بولو سیٹھ کیا کہتے ہو؟" عتیق اللہ نے تھکے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"نہیں بھئی، اتنی پگڑی کا فلیٹ ہم نہیں لے سکتے۔"

دلال نے گاہک پھنسانے کی ایک آخری کوشش کی۔ "آخر تم کتنے کا فلیٹ لیوگا۔" عتیق اللہ جھنجھلا کر بولا:-

"تم پگڑی کی بات کرتے ہو، یہاں اس کی گنجائش نہیں، پھر بات کیسے ہو۔"

اس کے بعد اس آدمی نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ آدمی بغیر کچھ کہے سنے اٹھ کر چل دیا۔ لیکن اس کے جاتے ہی قریب

کی میز پہ بیٹھا ہوا ایک اور آدمی اس کے پاس آ گیا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے اس سے پوچھا۔

"مکان چاہیئے ہے؟"

عتیق اللہ نے اس دفعہ بھی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ "ہاں چاہیئے تو ہے!"

نووارد بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "بہت پریشان معلوم ہوتے ہو۔"

وہ اس کی بات کو نظر انداز کر گیا۔ کاروبار میں وہ ہمدردی کا قائل نہ تھا۔ کہنے لگا۔ "چائے پیو گے؟" اس نے جواب دیا۔ "نہیں! ابھی چائے پی ہے۔"

"تو پھر سگریٹ پیو۔"

اس آدمی نے انگلیوں کے درمیان سُلگتی ہوئی سگریٹ سامنے کر دی۔

عتیق اللہ اس عرصہ میں کاروباری ڈھنگ سے بات کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ کہنے لگا۔ "پگڑی کے ہزار ہو گی؟"

وہ بگڑ کر بولا۔ "اگر پگڑی کی بات کرنا ہے تو دلال سے بات کرو۔"

عتیق اللہ، اس کے جواب پہ چونک پڑا۔ پہلی بار اس نے غور سے اجنبی کو دیکھا۔ گلے میں بندھا ہوا ریشمی رومال۔ میلی سی قمیص اور خوب گھیر دار لٹھے کی شلوار وضع قطع سے وہ بڑا طرح دار غنڈہ معلوم ہو رہا تھا وہ اس سے پوچھنے لگا:۔

"کیا کرتے ہو تم؟"

نووارد اسی بانکپن کے ساتھ تیوری پہ بل ڈال کر بولا۔ "تم کو مکان چاہیئے یا

کچھ اور؟" عتیق اللہ سمٹ پٹا سا گیا۔ کہنے لگا۔ "اس میں بگڑنے کی کون سی بات ہے میں نے تو یونہی پوچھ لیا" مگر اس آدمی کے انداز میں فرق نہ آیا۔

"تو پھر کام کی بات کرو۔"

محکمہ اطلاعات کے کلرک نے اس دفعہ ہتھیار ڈال دیئے۔ "اچھا یوں ہی سہی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ مکان کیسا ہے، کہاں ہے، کس طرح ملے گا؟ نووارد اس کو سمجھانے لگا۔

"یہ باتیں تم بعد میں بھی پوچھ سکتے ہو۔ پہلے تم میرے ساتھ چلو۔"

عتیق اللہ کے لئے اب زیادہ عذر کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے چپ چاپ کاونٹر پر جاکر پیمنٹ کیا اور غنڈوں کی سی وضع قطع کے اُسی آدمی کے ساتھ رکشا میں سوار ہو کر چل دیا۔

مختلف سڑکوں کا چکر کاٹنے کے بعد رکشا سولجر بازار میں ایک مکان کے سامنے جاکر ٹھہرا۔ عتیق اللہ نے رکشا کا کرایہ دینا چاہا تو اس نے روک دیا اور اصرار کرکے خود ہی کرایہ بھی ادا کیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر مکان کا دروازہ کھولا اور عتیق اللہ سے کہنے لگا "اندر آجاؤ۔" وہ خاموشی کے ساتھ مکان میں داخل ہو گیا۔

مکان کے اندر گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا نہ کوئی آہٹ تھی۔ نہ آواز۔ شہر کے اس قدر بارونق علاقہ میں واقع ہونے کے باوجود یہ مکان بڑا سنسان معلوم ہو رہا تھا۔ لمبی سی تاریک گیلری عبور کرکے دونوں جب ایک کمرے کے سامنے پہنچے تو وہ

آدمی بڑبڑانے لگا "معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک کوئی نہیں آیا" اس نے کمرہ کا دروازہ کھولا اور ماچس جلا کر دیوار کے قریب رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کر دیا۔ عتیق اللہ دہلیز پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس ویران مکان کے اندر آ کر وہ کچھ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ آدمی اونچی آواز سے کہنے لگا۔

"وہاں کیوں کھڑے ہو یہیں آ جاؤ"

عتیق اللہ سہما ہوا سا کمرہ کے اندر چلا گیا۔ اس نے دیکھا، کمرہ بڑا گندہ تھا فرش پر ایک میلی سی دری بچھی تھی۔ جس پر جا بجا سگریٹ اور بیڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ پان کی پیکوں کی گل کاریاں تھیں۔ کہیں پنسل سے فلمی گیتوں کے اشعار لکھے تھے، کہیں آدمیوں کی بھونڈی شکلیں بنی تھیں

عتیق اللہ خاموشی سے فرش پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ دری کا ایک کونا پلٹ کر اس نے نیچے سے ایک رجسٹر نکالا اور اپنی جیب میں لگا ہوا فونٹن پین نکال کر رجسٹر کے ورق الٹ پلٹ کر، ان پر کچھ لکھنے لگا۔

لیمپ کی روشنی کے سامنے بیٹھا ہوا وہ اجنبی، اجو وضع قطع سے صاف غنڈہ معلوم ہوتا تھا۔ سنسان مکان کی دیوانی میں عتیق اللہ کو اور بھی زیادہ خطرناک نظر آنے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہ آیا۔ اور نہ اس آدمی نے اس عرصہ میں اس سے کوئی بات کی وہ بڑی محویت کے ساتھ رجسٹر دیکھتا رہا۔

عتیق اللہ کی پریشانی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس آدمی نے اس دفعہ اس کی طرف دیکھا۔

"کہاں چلے؟"

عتیق اللہ کہنے لگا۔ "اب تو رات بہت ہو گئی۔ کل آجاؤں گا۔"

اس آدمی نے تیکھی نظروں سے اس کو گھور کر دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بے تکلفی سے کہنے لگا۔ "اماں یار تم بھی نہ جانے کیسے آدمی ہو۔ ذرا دیر اور ٹھہرو۔ خلیفہ جی اب آتے ہی ہوں گے۔" اس کو مجبوراً بیٹھنا ہی پڑا۔

وہ شخص عتیق اللہ سے بے نیاز ہو کر پھر رجسٹر میں مشغول ہو گیا۔ رات اب گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ باہر سڑک پہ آمد و رفت کم ہو چلی تھی آخر گیارہ بجے کے قریب گیلری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ذرا دیر بعد ایک آدمی کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ لیکن اس کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ پستہ قد گٹھے ہوئے جسم اور گھنی مونچھوں کے ساتھ بڑا خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ رجسٹر پر جھکے ہوئے آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"خلیفہ جی اندر آ جاؤ۔ یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔"

وہ اندر آ کر اطمینان سے بولا۔ "پہلے تو کبھی دیکھا نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ تھکا ہوا سا دیوار سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ گیا۔ "آج تو ان سالوں نے اپنی ذلیل کرا دی۔"

کمرے میں کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ خلیفہ جی کہنے لگا۔ "ابے بجنیا یہ لونڈے

ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ نہ جانے سالے کہاں جا کر مر گئے۔ کسی حرام کے تخم کا پتہ نہیں۔" بختیار کہنے لگا۔

"آتے ہی ہوں گے خلیفہ جی۔"

اس دفعہ خلیفہ نے علیق اللہ کو مخاطب کر کے کہا "کیوں جی یہ بختیار تمہارا کوئی رشتہ دار لگے ہے۔" علیق اللہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بختیار درمیان میں بول اٹھا۔

"نہیں خلیفہ جی، ان سے تو آج ہی ملاقات ہوئی ہے۔"

خلیفہ نے مشتبہ نظروں سے علیق اللہ کو دیکھا۔ بختیار فوراً اس کی نظروں کے اس انداز کو بھانپ گیا۔ کہنے لگا "خلیفہ جی یہ رہنے کو مکان چاہتے ہیں۔ بیچارے بہت پریشان تھے۔ دلالوں کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ میں کوئی ہفتہ بھر سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی دلال ساتھ ہے۔ چائے چل رہی ہے سوڈا لیمن آ رہا ہے۔ سگریٹ سلگ رہے ہیں۔ سیٹھ سیٹھ کہہ کے سالوں نے اچھے خاصے پیسے کٹوا دیئے اور کام ذرا بھی کر کے نہ دیا۔" خلیفہ نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے میاں! تم کہاں ان دلالوں کے پھیر میں پڑ گئے۔ یہ تو سالے حجامت کر کے رکھ دیتے ہیں۔" پھر وہ بختیار سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اچھا کیا کہ تم ان کو یہاں لے آئے۔ اپنے پاس یہ دو تین کمرے بیکار ہی

تو پڑے ہیں۔ کسی کا بھلا ہو جائے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔"

بختیار جھٹ سے بولا "یہی تو میں نے بھی سوچا۔ پھر ایک بار خلیفہ جی تم نے کہا بھی تھا۔" خلیفہ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی یاد آیا، مکان کا اس طرح آج کل کے زمانہ میں خالی رہنا ٹھیک نہیں۔"

خلیفہ نے کرتے کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور بنڈل عتیق اللہ کی طرف بڑھا دیا تو وہ کہنے لگا "میں نے آج بہت سگریٹ پی ڈالی۔ اس وقت جی نہیں چاہ رہا ہے۔" خلیفہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ بیڑی کا بنڈل اور ماچس سامنے دری پر ڈال دیئے اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا سوچتا رہا۔

پھر شلوار کے نیفے کو ٹٹولتے ہوئے بڑبڑانے لگا "اس سالے نے تو کمر میں گھاؤ ڈال دیا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے نیفے کے اندر سے لمبا سا چاقو نکالا۔ اور دری کے نیچے رکھتے ہوئے بولا:-

"ہاں جی، تم کو مکان چاہیئے ہے؟"

عتیق اللہ پہلے ہی سہما ہوا تھا۔ چاقو دیکھ کر اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ ہاتھ جوڑ کر انکار کر دے "نہیں بابا! میں تمہارے مکان سے باز آیا" مگر اب اس کا موقع نہیں تھا۔ دبی زبان سے بولا "مکان کے لیے تو مدت سے سرگرداں ہوں۔ دلال ہزاروں کی پگڑی مانگتے ہیں۔ اپنے پاس اتنی رقم کہاں؟"

خلیفہ ایک دم۔۔۔ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"اجی ان کی ایسی کی تیسی۔ تم ابھی جاکر اپنا سامان لے آؤ۔ اور یہ آگے کے دو کمرے لے لو۔" خلیفہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی۔ کہ اسی اثنا میں دو نوعمر لڑکے ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سلام خلیفہ جی۔"

"سلام خلیفہ جی۔"

وہ خلیفہ کے سامنے جاکر بیٹھ گئے۔ وہ بڑے رعب دار لہجے میں بولا "کیوں بے۔! کہاں سے آ رہے ہو۔ بڑی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔ کچھ کام دام بھی کیا یا یوں ہی بے فضول مستی دکھا رہے ہو۔ لاؤ۔ کیا لائے۔" دونوں نے جیبیں ٹٹول کر کچھ نوٹ اور ریزگاری اس کے سامنے ڈال دی۔ خلیفہ ان کو گننے لگا۔ روپے گننے کے بعد وہ بولا۔ "ابے یہ تو پورے پچیس بھی نہیں۔" ان میں سے ایک بولا "آج تو اپنا اڈہ بالکل خالی تھا۔"

خلیفہ بگڑ کر بولا "سالو تم ڈیوٹی پر تھے ہی کب۔ میں ابھی چکر لگا کر آ رہا ہوں۔ للّی اور کلّا تو وہاں تھے۔ باقی کسی حرام خور کا پتہ نہیں تھا۔ ہزار دفعہ کہا کہ بس اسٹینڈ پر دفتروں کی چھٹی کے وقت کے علاوہ ۸ سے ۹ بجے رات تک بھی کام ہوتا ہے۔ پر تمہارے تو دھیان کہیں اور ہوتے ہیں۔" وہ ان کو کئی منٹ تک اسی طرح ڈانٹتا رہا۔

ذرا ہی دیر بعد، دروازے پر ایک اور لڑکا نمودار ہوا۔ سانولی رنگت، بدن پر صرف بنیان اور گندہ نیکر۔ بال دلیپ کمار کی طرح الجھے ہوئے۔ ہونٹوں پر پان کی دھڑی۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتا آگے بڑھا۔ مگر خلیفہ پر نظر پڑتے ہی اس کی ستی گم ہو گئی۔ سہما ہوا سا دور کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے ڈانٹ کر کہا۔

"ابے منہ چھپا کر کیوں بیٹھ رہا ہے۔ سالے ادھر سامنے تو آ۔ آج بھی کوئی بہانہ بنا کرنے کا ارادہ ہے۔"

وہ کھسک کر روشنی میں آ گیا اور منمنانے کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"نہیں خلیفہ جی، قسم لے لو جو کچھ آج کام کیا ہو۔ ایک موقع لگا تھا مگر ہاتھ خالی گیا۔ سالا خواہ مخواہ فیل مچانے لگا۔" خلیفہ نے یقین نہ ماننے کے سے انداز میں کہا۔

"ابے تو کیا بھور یا دان نئیں تھا؟"

اتنے میں بھوریا بھی آ گیا۔ خلیفہ نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا "کیوں بے! یہ نوریا ٹھیک کے رہا ہے؟" وہ بگڑ کر بولا۔

"خلیفہ جی یہ صفا جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو سالا ایکٹر ہے ایکٹر۔ جب اس نے کام کیا تو میں جھٹ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مگر اس نے تو میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ میں نے اشارہ بھی کیا کہ رقم ادھر کسکا دے۔ لیکن یہ تو فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔"

خلیفہ کہنے لگا۔ "اور بر تو کے رہا تھا کہ ہاتھ خالی گیا۔"

بھوریئے نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ "لو اور سنو، میں نے خود اس کے ہاتھ میں بٹوہ دیکھا تھا۔ خلیفہ جی یہ سالا اپنے اس حرامی پن سے ایک دن سب کو پھنسوائے گا۔" خلیفہ کا چہرہ غصہ سے سُرخ پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"کیوں بے حرامی! اب یہ بلف چالیں تو ہم سے چلے گا۔ ادھر آ حرام خور تیری تو ـــــ!" خلیفہ نے ایک موٹی سی گالی دی۔ نوریا گڑگڑا کر کہنے لگا۔ "خلیفہ جی! یہ جھوٹ موٹ الزام لگا رہا ہے۔ باپ قسم، میں نے ایک لفظ جھوٹ نہیں کہا۔"

خلیفہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بختیار سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "ابے بختیار، اس حرام کے تخم کے لگا دو ٹھڈے۔ سالا اپنے سے نلائیٹین کرنے لگا ہے۔" بختیار نے آستین چڑھا کہ ایک ہی ٹھڈ لگایا تھا کہ نوریا چیں بول گیا۔

"ارے مر گیا خلیفہ جی، ابھی بتاتا ہوں۔" وہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔

بختیار کو دوسرا ٹھڈ لگانے کی ضرورت نہ پڑی۔ نوریا سسکیاں بھر کر کہنے لگا۔ "خلیفہ جی سچ کہہ رہا ہوں۔ گیارہ روپے ملے تھے۔ دس اس سالی، بانو نے رکھ لیئے۔ میں نے بہت کہا۔ پر وہ باز نہ آئی، کہنے لگی۔ جا نہیں دیتے کہہ دینا خلیفہ جی سے کہ بانو نے رکھ لیئے ہیں۔ ایک روپیہ بچا تھا، اس میں سے ۱۳ آنے یہ رہے" اس نے اپنی جیب سے کچھ ریزگاری نکال کر سامنے ڈال دی۔ خلیفہ نے خونخوار نظروں سے اس کو دیکھا۔

"تو یوں کہہ کہ سالے تو پھر اس نکٹی کے پاس گیا تھا۔ ابے وہ تو تیری ماں سے بھی بڑی ہو گی۔ سالے اس کے چکر میں پڑ گیا۔ تو کھونٹی پر لٹکانے کے قابل بنا دے گی۔ لاکھ دفعہ کہا کہ تو اس ٹکھیائی کے پاس مت جایا کر، پر تجھ کو تو سالے جوانی چڑھ رہی ہے جوانی۔ لگواؤں ابھی دو لھڈ اور۔"

نوریا بھوں بھوں کر رونے لگا۔ "مر جاؤں گا خلیفہ جی، میری توبہ، جو اب کبھی اس حرام زادی کے پاس جاؤں۔" خلیفہ اس کو بری طرح گالیاں دینے لگا۔

اس عرصہ میں اور بھی جیب کترے وہاں آ گئے تھے۔ ان میں ادھیڑ عمر کے گھاگ جیب کترے بھی تھے۔ مضبوط پٹھوں والے نوجوان بھی تھے اور دبلے پتلے پھرتیلے، کم سن لڑکے بھی تھے۔ کمرے کے اندر اب خاصی چہل پہل ہو گئی تھی، ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ جنہوں نے لمبا ہاتھ مارا تھا۔ وہ بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہے تھے۔ جو خالی ہاتھ لوٹے تھے، وہ جھینپے ہوئے سے بیٹھے تھے۔

خلیفہ ہر اک سے باری باری رقم وصول کرتا جا رہا تھا۔ اور بختیا اس کو رجسٹر میں درج کر رہا تھا۔ خلیفہ کسی کو شاباش دیتا۔ کسی کو گالیاں دیتا۔ کسی کو صرف سمجھا بجھا دیتا۔ عتیق اللہ کو یہ ساری باتیں بڑی تعجب خیز معلوم ہوئیں۔ کچھ تو اس لیے کہ یہ سب کچھ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ اور کچھ اس لیے کہ جو کوئی بھی آتا۔ اس کو گھڑی قدر حیرت سے دیکھتا۔ اس کی نئی بش شرٹ اور ریڈی میڈ خریدی ہوئی

کارڈرائے کی تپلون کا جائزہ لینا۔ پھر آپس میں اس کے متعلق کانا پھوسی ہوتی۔ اس وقت اس کو سخت جھنجلاہٹ ہوتی کہ خواہ مخواہ یہ سب اس کو بھی جیب کترا سمجھ رہے ہیں۔

جب ساری رقم اکٹھا ہو گئی تو خلیفہ نے اس میں سے ۲۵ فیصدی علیحدہ کرکے بقیہ روپے تمام جیب کتروں میں تقسیم کر دیئے۔ لیکن ان میں بھی درجے بنے ہوئے تھے

درجہ اول ۲۵ فیصدی۔

درجہ دوم ۱۵ فیصدی۔

درجہ سوم ۱۰ فیصدی۔

سب کو خرچ دینے کے بعد اس نے ایک لڑکے کو آواز دی "ابے فیاض ملا باری سے ۱۴ سنگل چائے کے لیے تو جا کر کہیو اور ہاں ایک پیکٹ کیپٹن سگریٹ کا بھی کہہ دیجیو۔"

ذرا ہی دیر بعد ہاہر والا چائے لے کر آ گیا۔

جب چائے کے دور سے فراغت ہو گئی تو خلیفہ، عتیق اللہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہاں جی تو اب آپ کا کام ہو جانا چاہیئے۔ بھئی معاف کرنا۔ ان سے نہ نپٹتا تو یہ سب جان کھا جاتے۔ چلو میں تم کو کمرے دکھا دوں۔"

اس نے اٹھ کر لیمپ ہاتھ میں لیا اور دونوں گیلری سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ کمرہ مکان کے باہری رخ پر تھا۔ عتیق اللہ نے دیکھا۔ کمرہ خاصا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ دوسرا کمرہ بھی ایسا ہی تھا۔ دونوں کمرے پختہ بھی تھے

اور ہوادار بھی۔

خلیفہ کہنے لگا "کمرے تم نے دیکھ لیے اب اپنا بسترا بچھا کر لو۔ میری مانو تو دو کمروں میں تمہاری مزے سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔" عتیق اللہ نے جواب دیا۔

"خلیفہ جی کمرے تو بہت اچھے ہیں اور میرے گزارے کے لیے کافی ہیں"

پھر اس نے دبی زبان سے کہا "کرایہ اس کا کتنا ہو جائے گا؟"

خلیفہ ہنسنے لگا۔ "اماں، تم بھی کیا بات کر رہے ہو، کرایہ اس کا کیا ہو گا؟"

مگر عتیق اللہ نہ مانا۔ اصرار کر کے بولا "پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرایہ دینا ہی ہو گا۔"

خلیفہ بدستور ہنستا رہا۔ "اچھا جی یوں کر لو کہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو تم چائے پانی کر دیا کرو۔ بس یہی دس پانچ روپے لگا کرے۔ اس طرح یہ لونڈے بھی خوش ہو جائیں گے۔ اور تم کو بھی اطمینان ہو جائے گا کہ تم مفت میں نہیں رہتے۔" وہ اس بات پر رضامند ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"خلیفہ جی جیسی آپ کی مرضی۔"

اس کے بعد خلیفہ نے مکان کے سلسلہ میں اپنی کچھ شرطیں بھی بتائیں۔ بڑے مشفقانہ لہجے میں بولا۔ "دیکھو بھائی اپنے کسی ملنے جلنے والے کو کبھی رات کے وقت یہاں نہ بلانا۔ دوسری بات یہ کہ مکان کا دروازہ کسی وقت بند نہیں رہے گا تم اپنے کمروں میں تالا ڈال سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کسی کے بہکائے سکھائے میں آ کر مکان کو الاٹ کرانے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔ یوں

تم ہمارے یار ہو۔ جب تک جی چاہے رہو۔" عتیق اللہ نے ساری شرطیں بلا حیل و حجت منظور کر لیں۔

جب ساری باتیں طے ہو گئیں تو خلیفہ نے فوراً اپنے شاگردوں کو بلایا۔ اور عتیق اللہ کے ساتھ کر دیا۔ اسی رات اس کا سامان اٹھ کر اس مکان میں آ گیا۔

اس آسانی کے ساتھ مکان مل جانے سے عتیق اللہ کو خوشی بھی ہوئی اور خوف بھی دامن گیر تھا۔ پولس کا خوف، بدنامی کا خوف اور سب سے بڑا یہ خوف کہ کہیں وہ بھی ان کے ساتھ رہ کر جرائم پیشہ نہ بن جائے۔ لہٰذا شروع شروع میں تو وہ بہت پریشان رہا۔ اور دوسرا مکان حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر نہ تو اس کو کوئی اور مکان ہی مل سکا اور نہ اس کی تنخواہ میں اتنی گنجائش تھی کہ ہوٹل میں جا کر رہائش اختیار کر لے۔ لیکن پریشانی کا یہ دور زیادہ مدت تک نہ چل سکا رفتہ رفتہ وہ اس ماحول سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ تمام جیب کترے اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ راہ میں کہیں مل جاتے تو بڑے تپاک سے سلام کرتے۔ چائے پینے کے لئے اصرار کرتے۔ بڑی مشکل سے وہ ان سے پیچھا چھڑاتا لیکن وہ سگریٹ پلائے بغیر تو اس کو جانے ہی نہ دیتے۔

یہی حال خلیفہ کا تھا۔ وہ ہفتہ میں دو چار بار ضرور اس کے پاس آتا بڑے گھریلو انداز میں باتیں کرتا۔ عام طور پر یہ ملاقاتیں شام کو ہوتی تھیں۔ مگر بڑی مختصر اس لیے کہ کوئی نہ کوئی جیب کترا اس عرصہ میں آ جاتا۔ اس کو دیکھتے ہی خلیفہ اٹھ

کر کھڑا ہو جاتا۔ اس موقعہ پر وہ ہمیشہ کہا کرتا "اچھا عتیق بھائی زندگی رہی تو کل پھر ملیں گے۔ اب اپنے دفتر کا وقت ہو گیا" اس دفتر والی بات پر عتیق اللہ کو بڑی ہنسی آتی۔ اس کے علاوہ خلیفہ اپنی اور بھی ایسی ہی اصطلاحات استعمال کرتا تھا وہ اس مکان کا ہیڈ کوارٹر، ۱۰ بجے رات کے وقت کو دفتر کا ٹیم۔ سب کے مل بیٹھنے کو میٹنگ اور جیب کتروں کو کاریگر کہا کرتا۔ خلیفہ کی کچھ خفیہ اصطلاحات بھی تھیں جن کو وہ خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتا تھا۔

جب کبھی کوئی نیا جیب کترا ان کی ٹولی میں شامل ہوتا تو اس روز خاص طور پر جشن منایا جاتا۔ دس سیر شیرینی، ہار پھول اور سگریٹ و چائے منگوائی جاتی۔ اس روز سارے جیب کترے سر شام ہی واپس لوٹ آتے۔ اور جب سب اکٹھے ہو جاتے۔ تو خلیفہ باقاعدہ وضو کرتا۔ اگر بتی سلگاتا اور شیرینی پر نیاز دے کر مٹھائی کا ایک ٹکڑا لے کر گروہ کے نووارد ممبر کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا۔ اور اپنے سر پر سے ٹوپی اتار کر اس کو ذرا دیر کے لیے پہنا دیتا۔ اس کے بعد یہ نیا ممبر سب سے بغل گیر ہوتا۔ اس کو ہار پھول پہنائے جاتے۔ شیرینی تقسیم ہوتی اور پھر ہنسی مذاق اور قہقہے شروع ہو جاتے۔ ایسے ہر جشن میں عتیق اللہ کو بڑے اصرار کے ساتھ بلایا جاتا۔ لیکن عتیق اللہ کو ایسے جھگڑے میں اس روز شریک ہونے میں بڑا لطف آتا جس دن خلیفہ سب کی نئے سرے سے ڈیوٹیاں مقرر کرتا تھا۔ یہ تبدیلی ہر پندرہ روز کے بعد ہوتی تھی۔ خلیفہ کسی کو اس سے زیادہ مدت تک ایک جگہ کبھی نہیں

دکھتا تھا۔ لہٰذا کسی کو ریلوے اسٹیشن، کسی کو بنک پر، کسی کو ہوائی اڈے پر مقرر کیا جاتا تا۔ ان میں زیادہ تر سینیر قسم کے جیب کترے ہوتے تھے ننھے "رنگروٹ" عام طور پر بازاروں اور بس کے اڈوں پر لگائے جاتے تھے۔

خلیفہ جس دن ڈیوٹی مقرر کرتا تھا۔ اس روز وہ سب کو گرہ کٹی کے فن پر اچھا خاصا لیکچر دیتا۔ نئے نئے گر اور نت نئے ہتھکنڈے بتاتا۔ عتیق اللہ نے اندازہ لگایا کہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے افراد کی نفسیات کو خلیفہ بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک روز ایسا ہوا کہ ملّی نے ایک سرکاری افسر کی جیب صاف کی۔ بڑا خوش تھا کہ ہاتھ مار لیا۔ مگر بٹوے سے صرف ۲ روپے اور کچھ ریزگاری نکلی۔ خلیفہ کو پتہ چلا تو اس نے ملّی کو خوب ڈانٹا، پھر پوچھنے لگا۔

"ابے یہ کام تو نے کہاں کیا تھا؟"

وہ بولا۔ "دفتر کے پاس جب وہ موٹر میں بیٹھ رہا تھا"

خلیفہ سر پر ہاتھ مار کر بولا۔ "بھئی کمال کر دیا اس بھتنی والے نے۔ بھلا یہ بھی کوئی کاریگری کا موقعہ تھا۔ ابے ایسے لوگوں کی جیب پر ہمیشہ صفائی اس وقت دکھائی جاتی ہے۔ جب وہ بازار میں موٹر سے اتر کر کسی دکان میں داخل ہو رہا ہو۔ وہ بھی مہینہ کی شروع تاریخوں میں"

اسی طرح ایک بار بھوریئے نے ایک عورت کے پرس پر ہاتھ مارا اور الٹا ادھر پڑا۔ پٹتے پٹتے بال بال بچ گیا۔ خلیفہ نے اس کی بھی خبر لی کہنے لگا "ابے

الّو کے پٹھے میں نے ہزار بار کہا کہ عورت پر کبھی ہاتھ نہ ڈالنا۔ وہ تو سالی یوں ہی چوکس چلتی ہے۔ پاس سے گزرو تو اس کے بدن میں گدگدی دوڑ جاتی ہے۔ ایسے کے ہاتھ لگانے کی کہاں گنجائش۔ پھر سالیاں فیل ایسا مچاتی ہیں کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے، خبردار جو آئندہ ایسا کیا ورنہ سالے خال کسی ڈن جیل میں دھرے ہو گے۔"

خلیفہ صرف نام کا خلیفہ نہیں تھا اپنے فن میں ماہر تو وہ تھا ہی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تمام شاگردوں کے رگ وریشے سے پوری طرح واقف تھا ہر ایک کی فطرت کا اس کو بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی اس سوجھ بوجھ پہ تو عتیق اللہ ایک دفعہ دنگ رہ گیا۔ وہ ہوا یہ کہ ایک روز اس کے کمرے سے گھڑی غائب ہو گئی۔ عتیق اللہ نے اس کو بہت تلاش کیا۔ جب نہ ملی تو اس نے خلیفہ سے شام کو اس بات کا تذکرہ کیا وہ کہنے لگا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں مل جائے گی۔"

عتیق اللہ چپ ہو گیا۔

خلیفہ جھنجھلا کر اپنے کاریگروں کو گالیاں دینے لگا۔ "عتیق بھائی، میرے یہاں بعض لونڈے سالے بڑے حرامی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ مہینہ کی آخری تاریخیں ہیں اپنے لوگوں کا حساب یہ ہے کہ ۱۰، ۱۲ تاریخ تک تو کسٹمر ڈھونڈنا نہیں پڑتا جس کے بھی ہاتھ ڈال دیا۔ کچھ نہ کچھ لے ہی نکلے۔ پھر ۲۰، ۲۲ تاریخ تک شکار

کو بھاپینا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد تو تم سے سچ کہہ رہا ہوں کہ بھائی اکثر تو اپنی جیب ہی سنبھال کر چلنا پڑتی ہے۔" عتیق اللہ کو اس بات پر ہنسی آ گئی۔

اسی روز رات کے وقت جب سب جیب کترے اکٹھے ہوئے تو خلیفہ نے اونچی آواز میں کہا۔ "آج دن میں عتیق بھائی کی گھڑی کسی اپنی ماں کے یار نے پار کر دی۔ سالے نے میری ناک کٹوا دی۔" اتنا کہہ کر اس نے سب کے چہروں کا بغور جائزہ لیا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ خلیفہ ایک ایک کے چہرے کو، آنکھوں کو، اس کی ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے کے اندر بالکل خاموشی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزرے۔ ایکا ایکی خلیفہ نے ڈانٹ کر کہا:۔

"ابے فیضو ادھر سامنے تو آ۔"

فیضو سہما ہوا سا اٹھ کر خلیفہ کے سامنے آ گیا۔ خلیفہ نے چیخ کر کہا "کیوں بے حرام کے تخم تیری تو . . . . . !" اس نے گالی دے کر بختیار سے کہا "پلا سالے کو کریلے کا پانی"۔ بختیار نے کمرے میں نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر ایک گندی سی شیشی نکالی جس میں ہرا ہرا عرق بھرا ہوا تھا اور لپک کر بڑی بے رحمی کے ساتھ فیضو کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ ملّی نے زبردستی فیضو کا منہ کھول دیا۔ بختیار نے کئی قطرے اس کے حلق میں ٹپکا دیئے۔ فیضو ہاتھ جوڑ کر غیں غیں کرنے لگا۔ خلیفہ بولا "چھوڑ دو سالے کو" دونوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ فیضو ابکائیاں لینے لگا۔ خلیفہ نے ڈانٹ کر پوچھا:۔

"کہاں ہے گھڑی؟"

وہ جلدی سے بولا۔"بیس روپے میں ایک جگہ رکھی ہے۔ ابھی جاکر لادوں گا۔"

خلیفہ نے ملّی سے کہا۔"ابھی جا ساتھ لے کے ساتھ۔" ملّی، فیضو کے ساتھ اٹھ کر چلا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد عتیق اللہ کو اس کی گھڑی واپس مل گئی۔

عتیق اللہ کو اس مکان میں رہتے ہوئے اب دو مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے وہ تمام جیب کتروں کی عادتوں سے اور ان کی اصطلاحات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ یہیں آکر اس کو اس بات کا بھی پتہ چلا کہ شہر میں جیب کتروں کی مختلف پارٹیاں ہیں۔ جنہوں نے اپنے حلقے بانٹ لیے ہیں۔ سب میں ایک طرح کا باہمی سمجھوتہ تھا۔ کوئی کسی کے علاقہ میں جاکر کام نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ایک بار ایسا ہوا کہ خلیفہ دن بھر کی کمائی اکٹھی کر رہا تھا کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سب گھبرا گئے۔ بختیار، خلیفہ کے اشارے پر فوراً باہر گیا۔ سب کے چہرے فق ہو رہے تھے۔ مگر جب بختیار ایک چھریرے جسم کے آدمی کو اندر لے کر آیا تو یہ گھبراہٹ جاتی رہی۔ خلیفہ ہنس کر بولا:۔

"میرے یار تو نے خواہ مخواہ کی کھلبلی مچادی تھی۔ خیریت تو ہے۔ آج ادھر کیسے نکل آیا؟" نووارد نے کہا۔"استاد نے کہلایا ہے کہ تمہارا ایک آدمی ہمارے علاقہ میں کام کر گیا ہے۔ یہ بہت بری بات ہے۔"

خلیفہ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔"ہاں جی! یہ بہت بری بات ہے۔"

پھر اس نے اپنے شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ابے تم میں سے کون گیا تھا استاد کلن کے علاقہ میں آج۔" بھوریا منمنا کے بولا۔

"خلیفہ جی وہ ایسا ہوا ——— !"

خلیفہ نے بات کاٹ کر اس کو ایک موٹی سی گالی دی اور پوچھنے لگا۔ "سالے وہ کیا تجھ سے پتلا موتتے ہیں۔ جو تو وہاں اپنی باندگی دکھانے گیا تھا۔ خیر اس دفعہ چھوڑے دے رہا ہوں۔ اب جو یہ حرکت سننے میں آئی تو سالے سمجھ لینا کہ منہ میں پیشاب کروا دوں گا۔"

وہ خوشامد کرنے لگا۔ "نہیں خلیفہ جی، اب جو ایسا کروں تو جو تمہارا جی چاہے کرنا۔"

خلیفہ نے پوچھا۔ "کتنی رقم لایا تھا۔"

وہ بولا۔ "۲۸۳ روپے تھے۔"

خلیفہ نے نودارد سے پوچھا۔ "کیوں جی یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

وہ کہنے لگا۔ "ہاں خلیفہ جی، اتنی ہی رقم ہو گی۔"

خلیفہ نے فوراً بختیار سے کہا۔ "نکالو جی روپے اور ان کا حساب بیباق کر دو۔" بختیار نے ۲۲۸ روپے نکال استاد کلن کے آدمی کو دے دیئے۔ اس نے روپے لے کر گنے اور ۷۰ روپے خلیفہ کی جانب بڑھا کر بولا۔ "خلیفہ جی یہ لو اپنا کمیشن، ۲۵ فیصدی کے اتنے ہی نکلتے ہیں۔ تم اپنا حساب لگا لو۔" خلیفہ کہنے

لگا۔ "بختیار کو دے دو۔"

جب وہ آدمی جانے لگا۔ تو خلیفہ نے اس کو روک کہا۔ "دیکھو جی استاد کلن سے میرا سلام کہنا۔ ان کو سمجھا دینا کہ یہ لونڈے بڑے حرامی ہیں۔ آئندہ جو بھی ایسی بگاڑ کی صورت پیدا کرے گا۔ سالے کی کھال میں بھس بھروا دوں گا۔ کہنا کبھی کبھا ادھر بھی نکل آیا کرو۔ بہت دن سے دیکھا نہیں۔ موقع ملا تو میں خود آؤں گا۔" وہ آدمی سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ عتیق اللہ ایک نئی الجھن میں پھنس گیا۔ بات یہ تھی کہ جب پچھلا مکان خالی ہونے والا تھا تو اس نے اپنے بال بچوں کو بڑے بھائی کے پاس کوئٹہ بھیج دیا تھا۔ کچھ عرصہ سے بیوی نے واپس آنے کا سخت تقاضا شروع کر دیا تھا۔ ہر خط میں یہی لکھا ہوتا کہ وہ آنے کے لیے آمادہ بیٹھی ہے۔ آخر اس نے ایک روز یہ مسئلہ خلیفہ کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ہنس کر بولا:۔

"عتیق بھائی تم نے بھی کمال کر دیا۔ اب تک مجھ سے بتایا بھی نہیں کہ بال بچے وہاں پڑے ہیں۔ نہیں جی ان کو تکلیف نہیں ہونا چاہیئے۔ آج ہی تار دے کر بلا لو۔ میں اپنا دفتر سب سے پیچھے والے کمرے میں لے جاؤں گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

لیکن عتیق اللہ اس کے اس قدر اطمینان دلانے پر بھی مطمئن نہ ہو سکا۔ جھجکتے ہوئے اس نے خلیفہ سے دل کی بات کہہ ہی دی۔ "مگر اس دھما چوکڑی

میں عورتوں کا رہنا مناسب نہ ہے گا۔" خلیفہ بڑے پیار سے ڈانٹ کر بولا۔
"تم بھی کیسے بات کرتے ہو۔ عتیق بھائی۔ کیا مجال جو کسی نے ادھر آنکھ کر دیکھا۔ سالوں کی بلیسہ پر رکھ کر بوٹیاں نہ کر دوں گا؟" وہ اس وقت بہت جوش میں آگیا تھا۔ اسی لہجہ میں بولا "بس جی تم سے کہہ دیا۔ بھابی اور بچوں کو اب کوئی تکلیف نہ ہونا چاہیئے۔ یار یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ کہ وہ اس طرح پریشانی اٹھائیں۔ رہی ان لونڈوں کی بات تو تم ان کی طرف سے اطمینان رکھو۔ بدمعاشی کرنے کے لیے بازار میں کچھ کمی ہے جو کوئی سالہ گھر پر ہی ڈاکہ ڈالنے کی نیت کرے گا۔"

مگر خلیفہ جس قدر مطمئن کرنے کی اس کو کوشش کرتا رہا۔ عتیق اللہ اسی قدر غیر مطمئن ہوتا گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ لوگ ٹھہرے جرائم پیشہ۔ ان کے قول و فعل کا کیا اعتبار۔ نہ جانے کس وقت کیا حرکت کر بیٹھیں۔ میں ان سے لڑ جھگڑ بھی نہیں سکتا۔ سالے مجھ کو ہی ٹھکانے لگا دیں گے۔ پھر بیوی آکر یہ دھم دھاڑ دیکھے گی۔ تو یہی کہے گی "واہ اچھی جگہ گھر لیا ہے۔ چور اچکوں میں لا کر ڈال دیا ہے۔" عتیق اللہ کی پریشانی بڑھتی ہی گئی۔

خلیفہ نے اسی روز شام کو دونوں کمرے خالی کر دیئے۔ اپنا سامان اٹھا کر سب سے پیچھے والے کمرے میں لے گیا۔ بختیار کو ہدایت کر دی کہ سامنے والے دروازے سے آمد و رفت بند کر دی جائے۔ اور پیچھے گلی میں

جو چھوٹا دروازہ کھلتا ہے۔ آئندہ سب لوگ اسی طرف سے آیا جایا کریں۔

اس واقعہ کے تین چار دن بعد ہی اس کی بیوی کا ایک اور خط آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ وہ عنقریب کراچی پہنچ رہی ہے، عتیق اللہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ یہ بات بھی خلیفہ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے سنا تو بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اسی وقت شاگردوں کو بلا کر کہا کہ سارے کمرے اچھی طرح صاف کر دیئے جائیں۔ مالک مکان سے خود جا کر ملا۔ کہ وہ بجلی لگانے کا فوراً بندوبست کر دے۔

مگر خلیفہ جس قدر سرگرمی کا اظہار کر رہا تھا، عتیق اللہ اس کو اسی قدر مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ ہی میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ خلیفہ اس کے بیوی بچوں کی آمد میں اتنی کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ اس سالے خلیفہ کا کیا ہے۔ نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ پتہ نہیں کیا حرامزدگی کر بیٹھے سوچتے سوچتے آخر عتیق اللہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

اسی روز رات کو ۹ بجے کے قریب، وہ حلقہ کے تھانہ پر پہنچا۔ انچارج تھانہ سے ملاقات کی۔ اور اس کو خلیفہ اور اس کے شاگردوں کا پورا پورا حال بتایا۔ انسپکٹر نے پوری توجہ کے ساتھ اس کی بات سنی۔ خوش ہو کر بولا۔

"مسٹر عتیق اللہ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں۔ اگر لوگ اسی طرح پولیس سے تعاون کریں تو پولیس جرائم کو یوں چٹکی بجانے میں ختم کر سکتی ہے۔"

عتیق اللہ کی موجودگی ہی میں اس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور کہنے لگا

"دیوان جی، ۱۰ - ۱۲ جوان فوراً اکٹھا کرو۔ سو لجر بازار میں ایک مکان پر چھاپہ مارنا ہے میں خود چلوں گا۔" ہیڈ کانسٹیبل اس کا آرڈر لے کر چلا گیا۔ انسپکٹر عتیق اللہ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا "میں ان سالوں کو آج ہی پکڑ کر حوالات میں بند کیے دیتا ہوں۔ حرامیوں نے شہر میں اودھم مچا رکھا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ شہر میں گرہ کٹی کی دس بیس وارداتیں نہ ہوتی ہوں۔"

وہ دیر تک جیب کتروں کو گالیاں دیتا رہا۔ اس نے عتیق اللہ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔

گھر جانے کا ابھی کوئی موقع نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنے ایک دوست کے یہاں چلا گیا۔ کوئی گیارہ بجے رات کو جب وہ اپنے دوست کے گھر سے نکلا تو وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

لیکن جب وہ خلیفہ کے "ہیڈ کوارٹر" پر پہنچا تو اس کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ حسب معمول سارے جیب کترے وہاں موجود تھے۔ خلیفہ کا چہرہ بڑا گمبھیر نظر آ رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی بڑے روکھے پن سے بولا۔

"تم آ گئے جی۔"

عتیق اللہ نے جلدی سے جواب دیا "ہاں خلیفہ جی۔ کوٹہ ابھی تار دے کر آیا ہوں۔ شاید پرسوں تک سب لوگ آ جائیں گے۔" خلیفہ نے ایک لمبی ہوں کی اور اس کی بات کو نظر انداز کر کے بختیار سے بولا:

"ابھی تک گدھا گاڑی نہیں آئی۔ یہ سب سالے نمک حرام ہو گئے ہیں۔ ان کی تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" خلیفہ نے ایک سانس میں کئی گالیاں بک ڈالیں۔

بختیار جھٹ سے بولا۔ "خلیفہ جی۔ بس آتا ہی ہو گا۔"

خلیفہ نے عتیق اللہ کی طرف نظریں اٹھائے بغیر بختیار سے کہا۔ "دیکھو جی گدھا گاڑی آتے ہی سامان لدنا شروع ہو جائے۔" عتیق اللہ نے سوچا کہ شاید خلیفہ اپنا سامان لدوا کر کہیں اور جا رہا ہے۔ لہٰذا اس نے دبی زبان سے پوچھا

"خلیفہ جی۔ کس کا سامان لدوا رہے ہو۔"

وہ کڑک کر بولا۔ "تمہارا اور نہیں تو کیا میرا سامان جا رہا ہے، باندھ لو اپنا بستر بوریا۔ بہت دن ہو چکی یاری۔" عتیق اللہ نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا:۔

"تو اس وقت رات میں میں کہاں جاؤں گا۔"

"جہنّم میں۔"

خلیفہ کا غصّہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ عتیق اللہ نے سوچا۔ یہ تو بہت برا ہوا یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ اس نے بگڑی بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "مگر خلیفہ جی، تم ایک بارگی اس طرح ناراض کیوں ہو گئے۔ آخر ہوا کیا۔" خلیفہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ گھنی مونچھیں پھڑکنے لگیں تھیں۔ اسی عالم میں بولا:۔

"ابے تو سمجھتا ہے کہ میں کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہوں۔ تیرے ایسے نہ

جانے کتنے لونڈے ٹانگ کے نیچے سے نکال دیئے ہیں۔"

عتیق اللہ کہنے لگا۔" مگر خلیفہ جی ــــــ!"

خلیفہ نے اس کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ چیخ کر بولا۔" مگر وگر کی ایسی کی تیسی اب تم میری آنکھوں کے سامنے سے دفان ہو جاؤ۔ ورنہ بختیار سے دو لٹھ لگواؤں گا تو سالے خان ہسپتال ہی میں نظر آؤ گے۔ ہم نے سوچا کہ چلو بھئی شریف آدمی ہے۔ پڑا رہے گا سالا۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ مگر تیرے تو نطفے میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ شیخ سعدی نے سچ کہا ہے کہ اصل سے دغا نہیں۔ کم اصل سے وفا نہیں۔" وہ دیر تک اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔ اور عتیق اللہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ کہ شاید خلیفہ کو اس کی حالت پر رحم آ جائے۔

اسی اثنا میں گدھا گاڑی آ گئی اور سامان لدنا شروع ہو گیا۔ عتیق اللہ نے ایک بار پھر خلیفہ کو منانے کی کوشش کی۔ کہنے لگا۔" خلیفہ جی ذرا باہر آ کر میری ایک بات تو سن لو۔" خلیفہ آنکھیں نیچے کئے ہوئے خاموش لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر خون خوار نظروں سے عتیق اللہ کی جانب دیکھا۔

"ابے جا رہا ہے یا بلواؤں کریلے کا بانی۔ سالا چق چق کئے جا رہا ہے۔" عتیق اللہ کی روح فنا ہو گئی۔ وہ گھبرا کر فوراً کمرے سے باہر چلا گیا۔

# راتوں کا شہر

دونوں کاٹھیاواڑی دلال بہت دیر سے کاٹن کی سٹہ بازی پر بات کر رہے تھے۔ پھر نہ جانے ان کو کیا سوجھی کہ اچانک میونسپل کارپوریشن کا ذکر لے بیٹھے اور آخر میں محکمہ موسمیات کو گالیاں دیتے ہوئے اٹھ کر چل دیئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خالی بنچ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

یہ اکتوبر کی ایک سنسان رات تھی۔ شبنم سے بھیگی ہوئی ہواؤں میں خنکی تھی، اور فضا میں ہلکا ہلکا غبار سا چھایا ہوا تھا۔ سڑکوں پر راہ گیروں کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی، اس مختصر سے ٹریفک آئیلینڈ پر کہیں کہیں لوگ سکڑے سکڑائے پڑے تھے۔ سیمنٹ کی بنی ہوئی بنچوں پر، ٹھنڈے فرش پر، درختوں کے نیچے، ہر جگہ انسانی جسم لاشوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

میں بنچ پر لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک شخص نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ اس نے بڑی بدتمیزی سے میری ٹانگوں کو ایک طرف ہٹایا اور بنچ پر جم کر بیٹھ گیا۔ مجھ کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ غصہ کی بات ہی تھی۔ اس روز بھی حسبِ معمول کہیں رات بسر کرنے کا بندوبست نہ تھا۔ لہٰذا بازار میں سناٹا ہوتے ہی میں نے یہاں کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے تھے۔ بڑی دیر کے بعد ایک خالی بنچ ملی، تو یہ شخص موت کے فرشتے کی طرح آدھمکا۔ میں نے اس کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وضع قطع سے وہ بڑا خطرناک معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ گھٹنوں میں سر دبا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ نم آلود ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی سنسان سڑک پر کوئی موٹر تیزی سے سنسناتی ہوئی گزر جاتی۔ رکشا اسٹینڈ پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھرتا۔ اور ڈوب جاتا۔ "ٹریفک آئیلینڈ" کے پاس پہنچ کر کوئی پپیہا دل آزردہ سے پی، پی کی آواز لگاتا اور کسی نئے فلم کا گیت گنگناتا ہوا گزر جاتا۔ میں آنکھیں بند کیئے ہر آہٹ کو، ہر آواز کو خاموشی سے بیٹھا سنتا رہا۔ میرے برابر بیٹھا ہوا وہ خطرناک غنڈہ بھی بالکل چپ تھا۔ شاید وہ اونگھ رہا تھا یا سو گیا تھا یا اس کو بھی میری طرح بنچ کے خالی ہو جانے کا انتظار تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد میں نے سنا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "کیوں جی کیا بجا ہو گا؟" معلوم نہیں اس کو یہ کیسے پتہ چل گیا کہ میں ابھی تک جاگ رہا ہوں۔

میں نے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر بڑی بے رخی سے جواب دیا۔

"میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔"

"کوئی ڈیڑھ بج گیا ہوگا۔" یہ بات اس نے اس طرح کہی، جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔ پھر اس نے کان میں لگے ہوئے آدھ جلے سگریٹ کا ٹکڑا نکالا اور اس کو سلگا کر کش لگانے لگا۔ لیکن وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہا کہنے لگا "یار آج سردی کچھ زیادہ ہے۔ جاڑا اب آ ہی گیا۔"

"ہاں" ۔ میں نے بڑا مختصر سا جواب دیا۔

وہ بولا "تو اب تم سو کیوں نہیں جاتے۔"

میں نے جل کر کہا "مجھ کو بیٹھ کر نیند نہیں آتی۔"

آدمی حساس تھا۔ میری بات کا مطلب فوراً بھانپ گیا ہنس کر کہنے لگا اماں تو یوں کہو، تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ لے بھائی میں تو چلا تو ناراض نہ ہو۔" اتنا کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کے وہاں سے کھسکتے ہی میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جھٹ سے پوری بنچ پر ٹانگیں پھیلا دیں۔ اور بازو پہ سر رکھ کر آنکھیں میچ لیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ پھر نازل ہوا اور بڑی بے تکلفی سے بولا:۔

"اماں کیا سو گئے؟"

میں مسٹ مارے خاموش پڑا رہا۔

وہ کہنے لگا۔ "استاد کیوں مکر گانٹھ رہے ہو ذرا ٹانگیں تو سرکاؤ۔"
مجھ کو اس کے اس انداز پہ ہنسی آ گئی۔ مجبوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تو بھئی اطمینان سے بیٹھو۔" اس کے سوا اور کہتا بھی کیا۔ پڑا رہتا تو وہ پھر ٹانگیں پکڑ کر ایک طرف کر دیتا۔ میں اس کا کیا بگاڑ لیتا۔

اب وہ خواہ مخواہ مجھ سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہنس کر بولا "یار خفا کیوں ہوتے ہو ابھی تو بہت رات پڑی ہے سو لینا۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ خود ہی چھیڑ کر بولا۔

"چائے پیو گے؟"

میں نے انکار کر دیا۔

"نہیں جی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ چائے پینے کا مزہ تو اسی وقت ہے" اتنا کہہ کر اس نے ایک مزے دار سی گالی دی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اپنی شلوار کا نیفہ ٹٹول رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لوہے کی ایک خم دار سلاخ نکال کر سامنے ڈال دی اور کمر سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "سالی نے کھا ڈال دیا" میں نے حیرت زدہ ہو کر ہاتھ بھر کے اس لوہے کے ٹکڑے کو دیکھا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟"

کہنے لگا "کمائی کا ٹھیکرا"۔ اور اسی طرح اطمینان سے بیٹھا کمر سہلاتا رہا

میں اور بھی حیرت زدہ ہو کر بولا:۔

"یار ٹھیک سے بتاؤ یہ کیا جادو منتر ہے۔"

میری بات پر اس کو ہنسی آ گئی۔ بڑی بے تکلفی سے بولا "پیارے دل خوش کر دیا۔ اومی تم بھی کیلنڈرے کے لگتے ہو۔" لمحہ بھر توقف کے بعد کہنے لگا "تو پھر ہو جائے کچھ چائے پانی، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی سانولے خاں ملا تھا۔"

مگر میرا اس کے ساتھ جانے کو جی نہ چاہا۔ "نہیں بھئی، مجھ کو تو اب تم سو ہی جانے دو۔" وہ باز نہ آیا۔ میرا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا "یار ان باتوں میں کیا دھرا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

بادلِ نخواستہ مجھ کو اس کے ہمراہ چلنا پڑا۔ کچھ دور تک ہم دونوں سنسان سڑک پر چلتے رہے۔ پھر ایک گلی کے نکڑ پہ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف ایک چوکنا نظر ڈالی اور لپک کر ایک دوکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اور لوہے کی خمیدہ سلاخ، کو تالے میں ڈال کر آہستہ سے بولا۔ "کھل تو جا میری جان۔ سم سم۔" اور تالا جھٹ سے کھل گیا۔ اسی وقت گلی کے دوسرے سرے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔

"دیکھو جی۔ چوکیدار آ رہا ہے۔ تم لپک کر اس کے پاس پہنچ جاؤ۔ اور اس کو باتوں میں لگا لو۔ بس یوں ہی کچھ پوچھنا شروع کر دو۔ میں تم کو نالے

کی پلیا پر ملوں گا۔ اور ہاں ——— !"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور دوکان کا ایک پٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ خوف کے مارے میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ یا اللہ یہ آج کس مصیبت میں پھنسا۔ ایکا ایکی بجلی کے کھمبے کے پاس روشنی میں ایک انسانی سایہ نظر آیا سوچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔ چوکیدار نے مجھ کو دیکھ کر دور ہی سے آواز لگائی۔

"کون ہے؟"

گھبراہٹ کے باعث حلق سے میری آواز نہ نکل سکی۔ مگر وہ میرے قریب نہ آیا۔ شاید وہ بھی خوف زدہ تھا۔ اس نے اس دفعہ کسی قدر اونچی آواز میں پوچھا۔

"کون ہے گلی کے اندر؟"

میں اب اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو۔" وہ سینہ تان کر بولا۔ "پر تم بولتا کیونہیں۔ سو ہاں اندھیرے میں کیا کرتا تھا۔ تمہارا وہاں کیا کام۔" ہزارہ کا وہ چوڑا چکلا پٹھان میرے سر ہو گیا۔ میں نے اس کو راضی کرنے کے سے انداز میں کہا۔

" لالہ بات یہ ہے کہ مجھ کو ایک آدمی کا پتہ معلوم کرنا تھا۔"

وہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ "رات کا دو بجے پتہ مولوم کرتا ہے۔ چہ خوب

بات کرتا ہے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اس سالے اٹھائی گیرے نے تو آج پھنسوا ہی دیا۔ یہ پٹھان کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ آس پاس کوئی اور چوکیدار نہ تھا۔ ورنہ دھر لیئے جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ آخر میں نے اس کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

"لالہ، تم ان کو ضرور جانتے ہو گے، ان کا نام عظیم اللہ ہے۔ وہ سرکاری دفتر میں افسر ہیں۔" میں نے خواہ مخواہ اس موقع پہ دو چار انگریزی کے الفاظ بول دیئے۔ یہ تکنک بڑی کارگر ہوئی۔ چوکیدار ذرا نرم پڑ گیا۔ کہنے لگا "عظیم اللہ ہاں ہم اس کو جانتا ہے، ایک دم لمبا ہے خوب شراب میں ڈاؤن رہتا ہے روز گھر میں جھگڑتا ہے۔ بُٹ بوم مارتا ہے۔"

میں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی "بالکل ٹھیک خان وہی عظیم اللہ اب تم یہ بتاؤ کہ اس کا فلیٹ کون سا ہے، بہت ضروری کام ہے" کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی، پھر خود ہی گھبرا بھی گیا۔ لیکن جب اس نے بتایا "پر وہ تو اب یہاں سے چلا گیا۔ اس کا لاہور بدلی ہو گیا۔" تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نہیں خان، وہ تو یہیں ہو گا۔"

وہ ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ "ہم کو ٹھیک سے نہیں معلوم یہ فلیٹ

میں رہنے والا سب لوگ، روز پگڑی پر فلیٹ چلاتا ہے۔ پتہ نہیں تم کس کو پوچھتا ہے؟"

میں نے اصرار کر کے پوچھا "خان بہت ضروری کام ہے۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

مگر اب وہ اکتا چکا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگا "بابا ہم کو کچھ پتہ نہیں، جاؤ آگے پوچھو۔" میں نے سوچا کہ اب تک تو ساؤلے خاں اپنا کام کر چکا ہوگا۔ لہٰذا میں نے اس چوڑے چکلے پٹھان سے مزید الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

کئی گلیوں کا چکر کاٹ کر جب میں نالہ کی پلیا پر پہنچا تو ساؤلے خاں وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھ کو دیکھتے ہی ہلکی سی سیٹی بجا کر سگنل دیا۔ وہ اندھیرے میں ایک دیوار کے پاس کھڑا تھا، کہنے لگا۔

"یار تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

میں اس کو اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ مگر اس نے پوری تفصیل نہیں سنی بڑے پیار سے میرے شانے کو تھپ تھپا کر بولا "استاد میں نے تو تیری ایک ہی بات سے تاڑ لیا تھا کہ یہ بڑے کام کا آدمی ہے" میں نے کہا۔

"اچھا تو اب مجھ کو چلنے دو۔ ورنہ بنچ پر کوئی اور آ دھمکے گا؟"

وہ ہنس کر بولا "چھوڑ یار۔ سالی بنچ کو، اب ذرا اپنے لوگوں کے ٹھاٹھ

ہوں گے۔ کام پورا چوکس ہُوا ہے۔"

میں نے پھر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی "نہیں بھئی سچ کہہ رہا ہوں مجھ کو بڑی نیند معلوم ہو رہی ہے۔" مگر وہ کہاں باز آنے والا آسامی تھا۔ کہنے لگا "دیکھو، استاد اب دل نہ توڑو۔ اس کام میں دونوں ہی کا ساجھا ہے۔ میں کبھی کھوٹا پن نہیں کرتا ہمیشہ مل بانٹ کر کھاتا ہوں۔" پھر وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔

"چل یار!" اور اس نے ایک موٹی سی گالی بک دی۔

ہم دونوں ایک بار پھر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لیکن اس دفعہ کشادہ سڑکوں کے بجائے ہم تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ اندھیرے کے باعث میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا۔ کہ اس نے کی بغل میں ایک ڈبہ سا دبا ہُوا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں اور بھی بدحواس ہو رہا تھا۔ کہ کہیں راستے میں گشت کرنے والا کانسٹیبل مل گئے تو دونوں مع مال مسروقہ پکڑے جائیں گے، کچھ یہی سوچ کر میں نے اس سے کہا:۔

"بھئی مجھ کو تو اب تم جانے ہی دو۔"

میری آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔ میری گھبراہٹ کو دیکھ کر وہ ٹھٹول بازی پر اتر آیا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ "یار تو اتنا ڈر کیوں رہا ہے، زائد سے زائد یہی تو ہوگا۔ کہ رات حوالات میں کاٹنا پڑے گی۔ دونوں مزے سے ٹانگیں پھیلا کر صبح تک سوئیں گے۔"

میں نے خاموش رہنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ شاید ابھی کچھ اور کہتا۔ اسی وقت قریب کی بلڈنگ سے ایک شخص تیزی سے نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا ہم دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ جب وہ دور چلا گیا تو سانولے خاں سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"سالے نے خواہ مخواہ ڈرا دیا۔ اپنا ہی کوئی بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔"

اس دفعہ بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دور تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے۔ آخر ایک ایسے مقام پر پہنچ کر ہم دونوں ٹھہر گئے۔ جہاں بہت سے نیم پختہ مکانات بنے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ اور بستی اندھیرے میں اونچی نیچی قبروں کی طرح ہیبت ناک نظر آ رہی تھی۔ پہلے سانولے خاں ایک بے حد تنگ گلی کے اندر داخل ہوا اس کے پیچھے پیچھے میں بھی آگے بڑھنے لگا۔ یہاں اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ سانولے خاں مجھ کو دھندلی پرچھائیں کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ ہم دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ گلی کے اندر چل رہے تھے، کوئی سو قدم ہم اسی طرح چلتے رہے پھر ایک مکان کی دیوار کے قریب سانولے خاں رک گیا۔ اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولا۔ "آگے جانے کی ضرورت نہیں۔" اس کے بعد وہ کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا جیب کہیں

سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تو وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ذرا دیر بعد آہستہ آہستہ دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز ابھرنے لگی۔ اسی وقت گھر کے اندر کسی کے کھانسنے کی آواز بھی سنائی دی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا اور دبی دبی سرگوشیاں ہونے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد سانولے خاں میرے پاس آیا۔ اور بہت آہستہ سے بولا "میرے ساتھ چلو" میں اس کے ہمراہ چلتا ہوا دروازہ پر پہنچا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ فوراً ہی کسی نے جھٹ سے دروازہ کا بولٹ چڑھا دیا۔ وہاں بالکل اندھیرا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک کمرے کے اندر پہنچے یہاں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ میں نے دیکھا ہم دونوں کے علاوہ کمرے کے اندر ایک اور بھی آدمی موجود تھا۔ وہ پستہ قد کا گول مٹول سا آدمی تھا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ فوراً ہی سانولے نے کہا۔

"سیٹھ یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

وہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ "اچھا اچھا بیٹھو۔ پر بڑی ہشیاری کی جرورت ہے۔ سالہ لوگ کتے کی طرح سونگتا پھرتا ہے۔" وہ خالص بمبئی والوں کے لہجہ میں بات کر رہا تھا۔ سانولے خاں جو ہمیشہ خوف کے موقع پر مسخرہ پن کرنے لگتا تھا۔ اس کو چھیڑنے لگا۔

"سیٹھ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم پکڑے جائیں گے۔ تو تم کو بھی ہمارے

ساتھ جیل کاٹنا پڑے گی۔ مزے کی گزرے گی۔ یہ تمہاری ساری توند دو ند ایک دم پچک کر رہ جائے گی ٹھیک ہے نا۔"

وہ بگڑ کر بولا "تم سالا بر دبر بدماسی کی بات کرتا ہے۔ہم کو تمہاری یہ مسکری بازی بالکل پسند نہیں۔" وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔

ساونلے اس کو منانے لگا۔" یار بیٹھ، تو تو مذاق ہی مذاق میں بگڑ بیٹھتا ہے۔ اچھا کام کی بات کرو۔" سیٹھ کو شاید اسی بات کا انتظار تھا۔ فوراً ہی راضی ہو گیا اس نے سامنے رکھے ہوئے چھوٹے سائز کے ریڈیو سٹ پر ہاتھ پھرا کر چاروں طرف سے دیکھا اور بڑا سوکھا سا منہ بنا کر بولا:-

"ساونلے یہ تم آج کیا کنڈھم مال اٹھا لیا۔ یہ تو بالکل گڑبڑ گھٹالا ہے۔"

ساونلے گردن ہلا کر بولا "واہ استاد یہ ایک ہی کہی۔ معاملہ کی بات کرو سیٹھ اپنے سے یہ ٹرکیں نہیں چلیں گی۔"

وہ کہنے لگا۔ "دیکھو بابا، یہ مشینری کا کام بڑا کھٹرناک ہے، کسٹمر لوگ اس کو کھریدتے ڈرتا ہے۔"

ساونلے خاں کے لئے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ ان کاروباری ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتا تھا، کہنے لگا، "سیٹھ، بات ٹھیک ٹھیک کرو۔ موسیٰ بھائی کا گھر یہاں سے دور نہیں وہ خوشی خوشی سودا کر لے گا۔ ایک بات بولو، کھریدو گے کہ نہیں۔" اتنا کہہ کر ساونلے ریڈیو سٹ کو اٹھانے لگا۔ وہ جھپٹے

سے بولا۔

"تم کس مافک بات کرتا ہے سانولے خاں، تمہارا ہمارا لین دین ہے تو اس کو بھی خریدے گا اور جو لائینگا وہ بھی خریدینگا"

"تو پھر بولو، کیا دیتے ہو۔ ایک دم فسٹ کلاس چیز ہے"

اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ نکلا تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھا۔ سانولے اتنی قیمت پر بیچنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ بڑی دیر تک حجت ہوتی رہی آخر سوا سو روپے پر سودا ہوا۔ اس میں سے بھی اس گول مٹول آدمی نے ایک روپیہ سانولے کی خوشامد کر کے توڑ ہی لیا۔

وہاں سے نکل کر ہم دونوں سیدھے ایک ایرانی ... ہوٹل میں پہنچے۔ سانولے اس وقت بادشاہ بنا ہوا تھا۔ آرڈر پہ آرڈر دے رہا تھا۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کئی بار چائے پی۔

نیند نے پھر مجھ کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ لہذا میں نے اس سے کہا "بھئی اب لیٹنے کا کچھ بندوبست ہونا چاہیئے" وہ جھوم کر بولا :-

"ہاں جی لیٹنے کا بندوبست بھی ہوگا اور ایسا ٹھاٹھ دار کہ تمہاری طبیعت پھڑک اٹھے گی"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، میں نے سوچا۔ اس سے اچھا اور کیا پروگرام

ہو گا۔ جھٹ سے آمادہ ہو گیا۔ سانولے نے کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا اور ہم دونوں باہر آ گئے۔ ایرانی ہوٹل سے ذرا فاصلہ پر پان کی ایک دکان ابھی تک کھلی تھی۔ وہ سیدھا وہاں پہنچا۔ لمبی سی ایک ڈکار لے کر اس نے پنواڑی سے بڑے رعب کے ساتھ کہا۔

"استاد دو میٹھے پان تو بناؤ۔ ایک میں چھالیا ذرا زیادہ ڈالنا"

پنواڑی نے دو پان لگا دیئے اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "آج تو بڑے زوروں پہ نظر آ رہے ہو، کیا رنگ ہے؟"

سانولے کہنے لگا۔ "ابے اپنے اوپر کب رنگ نہیں رہا۔ لا اندر سے دو سگریٹ بھی نکال۔ لگے دم مٹے غم!" وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ "یار آہستہ بول" یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف چوکنا نظروں سے دیکھا اور الماری کے پیچھے سے دو سگریٹ نکال کر سانولے کو دے دیئے۔

سانولے اس کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ "سگریٹ تو دے دیئے پر اس وقت کچھ معاملہ بھی گٹھ سکتا ہے۔" اس نے بدمعاشی سے آنکھ مار کر جیب کھنکھنا دی۔ پنواڑی بولا:۔

"وہ تو ابھی پہلے ہی تاڑ گیا تھا۔ مگر تم نے دیر کر دی۔ معاملہ مشکل ہی سے بیٹھے گا۔"

سانولے ڈانٹ کر بولا۔ "اب زیادہ نخرہ نہ کرو۔ سالے تم نے پچھلی

دوکان اب تک کیوں کھول رکھی ہے۔ پبلک کو گھسا پٹی پڑھاتے ہو۔" وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا۔

"یار سانولے خاں تو تو بُرا ہو جاتا ہے۔ بابا ناراض نہ ہو۔ تیرے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

پنواڑی نے گردن باہر نکال کر ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے رکشاؤں میں سے ایک کو اشارے سے بلایا۔ جب وہ قریب آ گیا تو اس نے پاس بلا کر اس سے کہا۔ "یہ دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے۔ کہہ دینا کہ اپنے ہی آدمی ہیں اور دیکھ بے تکرار مت کرنا جو دے دیں وہی لے لینا" جب وہ رکشا کے پاس چلا گیا تو پنواڑی نے سانولے سے کہا۔ "اس کو دو روپے دے دینا۔" سانولے نے جیب سے پانچ کا ایک نوٹ نکالا اور اس سے کہنے لگا۔

"یار میں یہ جھنجھٹ نہیں پالتا۔ تو خود اس سے نبٹ لینا۔"

پنواڑی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگا۔ "تم فکر نہ کرو۔ جاؤ اب دیر کیوں کر رہے ہو۔"

ہم دونوں رکشے پر جا کر سوار ہو گئے اور رکشا چل دیا۔ سانولے نے جیب سے دو سگریٹیں نکالیں۔ ایک خود سلگائی اور دوسری میرے منہ میں لگا کر بولا۔ "لمبا کش نہ لگانا۔" میں نے سگریٹ سلگا کر پہلا ہی کش لیا تھا کہ دم گھٹنے

لگا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ ایسی بو جو عام سگریٹوں کی بو سے تیز بھی تھی اور اس میں کڑواہٹ بھی تھی۔ میں نے دو تین بار کھانس کر جلدی سے پوچھا "اماں یہ کیسی سگریٹ ہے"۔ وہ لاپرواہی سے بولا:

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ لمبا کش نہ لگانا۔ ذرا تیز سگریٹ ہے"۔

میں آہستہ آہستہ سگریٹ پیتا رہا۔ اچانک مجھ کو محسوس ہوا کہ میرا سینہ سلگ رہا ہے۔ گردن کی رگیں تن رہی ہیں اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے پردے لہرا رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر قمیص کے بٹن کھول دیئے۔ ہوا لگی تو پردے اور بھی تیزی سے لہرانے لگے۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی جھومنے لگا۔ ایک بار جھونک میں آ کر میں سانولے پر آ گیا۔ وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کر بولا "بڑے زوروں پہ جا رہے ہو یار۔ معلوم ہوتا ہے کہ رنگ چڑھ گیا ہے"۔ میں جھٹ سے سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"بھئی سانولے یہ کس تمباکو کی سگریٹ ہے"۔ مجھ کو اپنی آواز اس طرح معلوم ہوئی۔ جیسے میں کہیں دور سے بیٹھا بول رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"میری جان اس کو سلفہ کہتے ہیں۔ کہو مزہ آ گیا"۔

سلفہ کا نام سنتے ہی میں ایک دم سے گھبرا گیا۔ اس وقت رکشا بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ میں نے روشنی میں دیکھا۔ سانولے کی آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں، وہ جھوم جھوم کر اپنی کھونڈی

آواز میں گا رہا تھا۔" لگے دم، مٹے غم" سانولے خاں اس وقت مجھ کو بے حد خطرناک آدمی معلوم ہوا پتہ نہیں وہ اس وقت مجھ کو کہاں لیئے جا رہا تھا۔ اس لیئے کہ ہنوارٹی سے اس نے اشاروں ہی اشاروں میں جو باتیں کی تھیں وہ میرے لیے معمہ نہیں تو کم از کم عجیب وغریب ضرور تھیں۔ اسی طرح سوچتے سوچتے ایک بارگی میرے جسم کے اندر سے ایک رَو نکلی اور اس طرح سر پہ پہنچی کہ میں لڑکھڑا کر آگے کو جھک گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں، اسی وقت میں نے سانولے کی آواز سنی، وہ کہہ رہا تھا۔

"اماں تم تو بالکل میر پھویا ہو"

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سڑک کی ایک موڑ پہ اندھیرے میں رکشا کھڑا تھا۔ سانولے نے مجھ کو سنبھال کر اتارا۔ رکشے والا کہہ رہا تھا "میں ابھی آیا" اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ہم دونوں سڑک کے کنارے خاموش کھڑے رہے۔ ذرا دیر بعد وہ واپس لوٹا اور سانولے سے بولا "چلیئے جی" ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ ایک دومنزلہ عمارت کے قریب رک کر اس نے دروازہ کو آہستہ سے کھولا۔ اور ہم تینوں زینہ طے کرتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔

سامنے ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ خاصہ سجا سجایا کمرہ تھا۔ دیواروں پہ جاپانی لڑکیوں کی بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں۔ جن کی

سڈول پنڈلیاں، خاص زاویے سے نظر آ رہی تھی۔ کمرے میں ایک طرف ایک پرانا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ جس پہ بھاری بھرکم جسم کی ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی۔ ہم دونوں کو اس نے بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولی۔

"اس وقت ہم کسی کو اندر آنے نہیں دیتے۔ ۔ ۔ بارہ بجے اور پھاٹک بند۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ۔ تم سلیمان کے جاننے والے ہو۔ اس لیئے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن آئندہ آنا تو جلدی آنا۔"

اس خرانٹ نائکہ نے اچھا خاصا لکچر دے ڈالا۔ سانولے بھی اس وقت کچھ کچھ کڑی بھولا ہوا تھا۔ بالوں کو کریدتے ہوئے آہستہ سے بولا۔" نہیں بائی جی آئندہ ایسا نہیں ہوگا، وہ بات یہ ہوئی ——!" مگر اس کو زیادہ صفائی دینے کی ضرورت نہ پڑی۔ اسی وقت کمرے کے اندر دو لڑکیاں داخل ہوئیں ایک خاصی بھرے بھرے جسم کی تھی۔ اور دوسری کچھ بیمار نظر آ رہی تھی۔ دونوں شاید ابھی ابھی میک اپ کر کے آئی تھی، چہرے پہ پوڈر کھریا مٹی کی طرح لپا ہوا تھا جلدی میں کاجل پھیل گیا تھا اور لپ اسٹک کے دھبے رخساروں کے نچلے حصہ پر نظر آ رہے تھے۔

میں نے نظریں چرا چرا کر دونوں کو دیکھا۔ مجھ کو وہ بڑی ٹوٹی پھوٹی ہوئی سی معلوم ہوئیں۔ البتہ سانولے اپنی سُرخ سرخ آنکھوں سے دونوں کو اس طرح

دیکھ رہا تھا، جیسے "ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ" والا اشتہار پڑھ رہا ہو۔ لیکن ادھیڑ عمر کی عورت نے اس کو دیکھنے کا موقعہ نہیں دیا، پوچھنے لگی۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

سانولے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کہو اُستاد کیا کہتے ہو؟" مجھ کو خاموش دیکھ کر وہ بڑی بے حیائی سے بولا "اماں تم تو شرمائے جا رہے ہو۔ تم سے تو یہ عورتیں اچھی ہیں۔ کیسے دیدے نکالے دیکھ رہی ہیں۔ بس تم بھی ایک دم فٹا فٹ ہو جاؤ۔"

میں نے جلدی سے کہا "میں کیوں شرمانے لگا" اور میں نے دونوں لڑکیوں کی جانب نظریں اٹھا دیں۔ ایک تو خاموش رہی۔ لیکن جس کا جسم ذرا گداز تھا وہ بڑے بھدّے پن سے اٹھلا کر بولی "اے اس طرح دیکھو گے تو ہم کو نظر لگ جائے گی۔" اور وہ دوسری کے ہیٹھ کے پیچھے منہ چھپانے لگی۔ عجیب بے ڈھنگا مذاق تھا۔ مگر سانولے اس کی اس ادا پر مر مٹا۔ جھوم کر بولا۔

"بائی جی۔ اب معاملہ کی بات کرو۔"

وہ بولی "چلو پہلے میں تم کو جگہ بھی دکھا دوں۔ اس کے بعد بات ہو گی" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں کو لیے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔ سامنے مختصر سی چھت تھی۔ اس کے بعد ایک گیلری تھی۔ جس کو عبور کر کے ہم دونوں ایک سائبان کے قریب پہنچ گئے۔ اس عورت نے سوئچ دبا کر

روشنی کی تو میں نے دیکھا کہ سائبان کے نیچے لکڑی کے تختوں کی دیواریں کھڑی کر کے، کئی چھوٹے چھوٹے کیبن بنا دیئے گئے ہیں۔ ہر کیبن میں پلنگ پڑا تھا۔ اور میز کرسی بھی موجود تھی۔ بالکل سستے قسم کے ہوٹلوں کا سا بندوبست تھا۔

عورت کہنے لگی۔

"اس وقت تو یہی ملیں گے، سارے کمرے بک ہو چکے ہیں۔ لیکن تم کو یہاں بھی ہر چیز مل جائے گی۔ شراب چاہو گے تو وہ بھی مل جائے گی۔ ویسی شرابوں میں ہمارے پاس صرف ہریجنا ہے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ مگر اس کا بل آرڈر کے ساتھ ادا کرنا پڑے گا۔"

اس نے ساری تفصیلات ایک ہی سانس میں بتا دیں۔ بڑی سُلجھی ہوئی کاروباری عورت تھی۔ اس کے بعد وہ ہم دونوں کو پھر اسی کشادہ کمرے میں لے آئی۔ سانولے نے دونوں لڑکیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے گھور کر دیکھا اور پوچھنے لگا۔

"اب جو کچھ اور بات رہ گئی ہے وہ بھی کہہ ڈالو۔"

وہ بولی۔" پورے ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔" سوچ لو۔ سمجھ لو۔"

سانولے کہنے لگا۔" بائی جی یہ تو بہت ہے اب رات تو سمجھو گزر چکی ہے۔"

وہ اسی انداز سے بولی۔" ہمارے یہاں بھاؤ تاؤ نہیں ہوتا۔ بس ایک بات ہے رقم رکھو اور مال اٹھاؤ۔"

سانولے اس کے انداز سے پھر بھی متاثر نہیں ہوا ہنس کر بولا "۸۰ روپے بولو تو سیدھے ہاتھوں سے تمہاری نذر کر دوں" وہ پرانے نمائش بینوں کے انداز سے بات کر رہا تھا۔ عورت رضامند نہ ہوئی کہنے لگی "ایک بار ہم نے کہہ دیا کہ بھاؤ تاؤ کرنا ہو تو کہیں اور چلے جاؤ۔ شہر میں بہت سے چکلے موجود ہیں" یا تو وہ عورت اسی طرح بات کرنے کی عادی تھی۔ یا ہم دونوں کا پھٹیچر حلیہ دیکھ کر اس طرح بات کر رہی تھی۔ لیکن وہ جس قدر آن بان کا مظاہرہ کر رہی تھی سانولے اسی قدر بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ انکار کرتی رہی اور وہ اس کے ہر انکار پر پانچ روپے بڑھاتا گیا۔ لیکن سو روپے پر بولی رُک گئی۔

آخر جب کسی طرح سودا نہ ہوا تو ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سانولے نے واپس لوٹتے ہوئے اس کو دس روپے ہرجانے کے طور پر دینا چاہے۔ تو اس نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ زینے کے دروازے تک وہ ہم دونوں کو پہنچانے آئی۔ نہ اس نے کسی ناراضگی کا اظہار کیا۔ نہ ناک بھوں چڑھائی سڑک پر آ کر ہم نے دیکھا کہ رکشا والا ابھی تک وہاں کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ سودا پٹا نہیں۔ قریب آ کر کہنے لگا "اجی میرا تو پہلے ہی آپ لوگوں کو یہاں لانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ان سالیوں کے تو بڑے دماغ چڑھے ہوئے ہیں۔ پھر آج کل تو کہیں باہر کے فوجیوں کا جہاز آیا ہوا ہے۔ اس لیے ان کے نخروں میں اور بھی گرم مصالحہ پڑ گیا ہے۔ ان کی سچ پوچھیے تو جی

آمدنی ہی ان سے ہے۔ سالیاں بالکل میمیں بن گئی ہیں ایک دم ــــ!" وہ سانولے کی کدورت دور کرنے کے لیے الٹی سیدھی ہانک رہا تھا کہ لگے ہاتھوں کچھ مل جائے تو اوراینٹھ لوں۔ سانولے واقعی کچھ خاموش سا ہو گیا تھا اس کی بات کاٹ کر بولا:۔

"مار سالیوں کو گولی۔ چل تو ہم دونوں کو پرانی نمائش چھوڑ دے۔"

میں نے کہا "سانولے اگر میرا کہنا مانو تو تم جا کر ٹھہر جاؤ۔ میں تو اب کہیں جا کر پڑ رہوں گا۔ اس کے بجائے تم مجھ کو ۱۰ روپے دے دو۔" مگر وہ آمادہ نہ ہوا، کہنے لگا "یار تم نے تو کمال کر دیا۔ بھئی حد ہو گئی۔ تم نے سانولے خاں کو اتنا نیچ کیوں سمجھ لیا، یار ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ اب تو جہاں جائیں گے ساتھ ہی جائیں گے۔" اور وہ اچک کر رکشا پر بیٹھ گیا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر برابر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"چلو اب چل کر سونے کا انتظام کرتے ہیں۔"

اس کے بعد رکشا چل دیا، اور سانولے خاں جھوم جھوم کر اپنی بے ڈھنگی آواز سے گانے لگا۔ اب وہ پھر فارم میں آ گیا تھا۔

پرانی نمائش کے پاس پہنچ کر اس نے رکشہ والے کو ایک روپیہ دیا اور مجھ کو لیئے ہوئے لکڑی کے ایک کیبن کے پاس پہنچ کر پکارنے لگا "کلّن اماں کلّن سو رہے ہو۔"

اندر سے کسی نے پوچھا "کون ہے جی؟"

سانولے بولا "ابے خلیفہ میں ہوں سانولے۔"

وہ کھانستا ہوا اٹھا اور دروازہ کھول کر بولا "اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟" سانولے کہنے لگا "فی الحال تو تمہارے کیبن کے اندر سونے کا ارادہ ہے۔ سخت نیند آ رہی ہے۔" کلن نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کچھ سوچنے لگا۔ سانولے نے ڈانٹ کر کہا۔

"ابے سوچ کیا رہا ہے۔ دروازے سے ہٹ۔ میں اندر آ رہا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا "ٹھہر تو یار، اندر تیری بھابی لیٹی ہے۔" سانولے نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ابے کیا تیری گھر والی آ گئی؟ سالے تم دونوں ہی بے غیرت ہو، کہاں تو کل تک طلاق طلاق ہو رہی تھی اور آج پھر کیبن آباد ہے۔"

کلن کہنے لگا "اماں اب تم سے کیا کہوں، سب نے مل کر ——!"

اسی وقت اندر سے ایک عورت کی آواز ابھری "بھائی سانولے دیکھو پھر انہوں نے وہی باتیں شروع کر دیں۔ جس کی نو سو دفعہ غرض پڑی تھی۔ وہ خوشامد کر کے لایا تھا۔ میں کسی کے پاس سفارش ——" کلن نے جلدی سے کہا

"نیک بخت تو نے میری بات تو پوری سنی ہوتی۔"

مگر وہ بڑی تیز و طرار عورت تھی۔ اس نے کلن کی ایک نہ سنی۔ بس اپنی

ہی کہتی رہی۔ سانولے نے دونوں کو ڈانٹا اور ایک دس روپے کا نوٹ کلن کو دے کر بولا "میری طرف سے بچوں کو دے دینا۔"

کلن کہتا ہی رہا کہ اماں پان تو کھالو مگر، وہ وہاں نہ ٹھہرا۔

اب ہم دونوں کے سامنے پھر وہی مسئلہ تھا کہ رات کہاں کاٹی جائے کچھ وقت تو ہم دونوں نے سڑک کے کنارے، رکشا والوں کے اڈے پر گزار دیا۔ یہاں چھوٹا سا ایک الاؤ دہک رہا تھا۔ جس کے گرد رکشا والے اکٹھے بیٹھے تھے۔ پاس ہی سماوار میں بنی ہوئی چائے لئے ہوئے ایک چائے والا بھی موجود تھا۔ ہم دونوں نے اس سے چائے کی ایک ایک پیالی لے کر پی۔ اس وقت اس کی چائے نے بڑا مزہ دیا۔

سانولے کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "چل یار ایک جگہ اور چلتے ہیں۔ یہاں اوس میں تو دونوں کا پلیتھن نکل جائے گا۔" اس بار بھی اس نے پوری بات نہیں بتائی۔ رکشا لیا اور دونوں چل دیئے۔

پٹیل پاڑہ کی ایک سنسان سی گلی کے پاس اس نے رکشا رکوایا اور اس کو کرایہ دے کر گلی کے اندر گھس گیا۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی لہرائی اور کسی نے آہستہ سے پوچھا،۔

"کون ؟"

سانولے بولا "پیا باطم"

اس دفعہ اس آدمی نے لہجہ پر زور دے کر کہا۔ "ٹھیک سے بولو کس کے پاس جانا ہے؟"

سانولے پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہؤا برابر آگے بڑھتا ہی چلا گیا اور قریب جا کر بولا۔ "ابے آج تیری ڈیوٹی لگی ہے، سالے اب ہم کو پہچانو گے بھی نہیں۔" اور اس نے فوراً سانولے کو پہچان لیا۔ "اماں خان صاحب تم ہو، یار میں نے کہا اتنی رات گئے یہ کون آ دھمکا۔" سانولے پوچھنے لگا۔

"کیا رنگ ڈھنگ ہے؟"

وہ بولا۔ "آج تو بڑے زوروں کا معرکہ ہے۔"

اس کے بعد وہ ہم دونوں کو ٹھہرا کر برابر والے مکان کے اندر گیا۔ واپسی پر ہم دونوں اس کے ہمراہ اندر پہنچ گئے۔ یہ ایک لمبا سا کمرہ تھا اور دیواروں پر کئی لیمپ جل رہے تھے۔ پھر بھی روشنی بڑی بیمار سی نظر آ رہی تھی۔ کمرے کی فضا تمباکو کے دھوئیں سے گھٹی ہوئی تھی۔ سامنے دری پر بہت سے آدمی پاگلوں کی طرح زور زور سے بول رہے تھے۔ بال بکھرے، چہرے خوف ناک حد تک پریشان۔ اس گھٹی ہوئی فضا میں تاش بٹ رہے تھے اور داؤں لگ رہے تھے۔

اس قمار خانے کو دیکھ کر مجھ کو جتنی گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ سانولے کا

چہرہ اتنا ہی کھل گیا تھا۔ وہ مجھ کو لیے ہوئے اس جمگھٹے میں شامل ہو گیا۔ جیب سے اس نے دس کا ایک نوٹ نکال کر رکھ دیا۔ اور چلانے لگا۔

"دو روپے پر دہلا اندر۔"

برابر سے آواز آئی۔ "پتہ مار کر دو روپے پر دہلا باہر۔"

سانولے بولا "اور لگاؤ پورے پانچ کر لو۔"

اس آدمی نے کہا "چلو یہی سہی۔" پھر تاش بانٹنے والے سے بولا۔ "پھینک دہلا باہر۔"

تاش برابر پلٹتے رہے۔ سانولے نے ایک دوسرے جواری سے بھی داؤں لگایا۔ وہ اب بڑے تال سُر کے ساتھ کہہ رہا تھا "دہلا اندر۔ پنجہ باہر" اتنے میں بانٹنے والے کے ہاتھ کے نیچے اینٹ کا دہلا آکر گرا۔ سانولے نے بڑھ کر تاش کو چوم لیا "ہے جیو میرے راجہ" تھوڑی دیر بعد وہ دوسرا داؤں بھی جیت گیا۔ اس نے جلدی سے سارے روپے سمیٹ کر سامنے کر لیے۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

"ابے ذرا دیکھ کے، پہلی جیت منگائے بھیک۔"

سانولے نے گھور کے اس آدمی کی طرف دیکھا "دیکھ بے ہاتھ پر بولا تو سالے کے وہ ہاتھ دوں گا کہ بتیسی باہر نکل پڑے گی۔"

میرے لیے یہ سب کچھ دلچسپ بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ لوگ

ہار رہے تھے اور جیت رہے تھے۔ جیت رہے تھے اور ہار رہے تھے سگریٹ اور بیڑی پر لمبے لمبے کش لگ رہے تھے۔ جس کے دھوئیں نے کمرے کی فضا دھندلی کر دی تھی۔ سانولے کچھ دیر تک تو مجھ سے کچھ نہ کچھ بات کرتا رہا اس کے بعد کھیل میں وہ اس طرح الجھا کہ تن من کا ہوش نہ رہا۔ ادھر مجھ کو کچھ عرصہ تک تو جوئے کا یہ ہنگامہ اچھا لگا۔ لیکن رفتہ رفتہ دلچسپی کم ہوتی گئی اور نیند کا احساس بڑھنے لگا۔ مجھ کو نہیں پتہ کہ میں کب سویا البتہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا۔ سانولے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔ "یار تو تو گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔" میں بڑی گہری نیند میں تھا۔ اس کا اس طرح جگانا بڑا شاق گزرا۔ بادلِ نخواستہ اٹھنا پڑا۔

کمرے کے اندر ابھی تک لوگوں کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ تاش بٹ رہے اور روپے کھنک رہے تھے۔ لیکن سانولے نے پلٹ کر کسی طرف نہیں دیکھا۔ مجھ کو ساتھ لیے ہوئے باہر آ گیا۔ اندھیری گلی کو عبور کر کے جب ہم دونوں سڑک پر پہنچے۔ تو رات کا اندھیرا ابھی تک ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ بحیرۂ عرب سے آنے والی ہوائیں اور بھی زیادہ نم آلود معلوم ہو رہی تھیں۔ سانولے اس وقت بالکل خاموش تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کے مجسمہ کی طرح ٹھوس نظر آ رہا تھا۔ نہ اس پر دکھ تھا نہ مسرت، البتہ اس کی آنکھیں اور بھی زیادہ سرخ معلوم ہو رہی تھیں۔ چلتے چلتے میں نے خاموشی سے اکتا کر پوچھا

"میں تو سو گیا تھا، بعد میں تمہارا کھیل کیسا رہا؟"

وہ کہنے لگا۔ "تمہارے پاس کچھ ہو تو چل کر چائے پلا دو۔"

میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا سب ہار آئے؟ تم نے تو حد کر دی۔"

وہ بولا۔ "چھوڑ یار! جوئے میں اور ہوتا کیا ہے ہار یا جیت۔ چل پہلے چل کر مجھ کو ایک چائے پلا۔ سالا سر میں درد ہو رہا ہے۔"

مجھ کو اس کی اس بات پر سخت تاؤ آیا۔ میں دس روپے مانگتا رہا تو سالا ہر بار ٹال گیا۔ اب جیب میں دو چار آنے پڑے ہیں۔ اس میں بھی ساجھا لڑتا رہا ہے اور رات بھر جگایا گھاتے ہیں۔ جوں جوں مجھ کو اس بات کا خیال آتا میرا غصہ اور بھی بڑھتا جاتا۔ اب ہم دونوں خوجہ جماعت خانے سے آگے بڑھ کر سوجے بازار جانے والی سڑک پر آ گئے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور کہر کا دھندلا دھندلا غبار۔ اور اس سرمئی غبار میں سڑک کے دونوں طرف بنی ہوئی خوب صورت عمارتیں اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کائنات کی ہر چیز خوابیدہ تھی۔ صرف ہم دونوں جاگ رہے تھے۔ جن کے لیے نہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ تھا، نہ کوئی منزل اور رات اتنی آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے کبھی ختم نہ ہو گی۔

اسی طرح بے تکی باتیں سوچتے سوچتے میں نے سانولے کی جانب دیکھا وہ ابھی تک بت کی طرح خاموش تھا۔ مجھ کو اس وقت وہ بڑا غلیظ اور قابلِ نفرت معلوم ہوا۔ اگر میں اس کے ساتھ یوں ہی چلتا رہوں گا۔ تو یہ نفرت

اور بڑھتی جائے گی۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا: "اچھا تو بھئی سانولے میں تو اب ایک جگہ اور جاؤں گا" اور میں سڑک کے ایک موڑ پر مڑنے لگا۔ تو سانولے نے چونک کر کہا:۔

"ایسی بات مت کہو۔ اب تم بھی اس وقت ہمارا ساتھ چھوڑ دو گے۔ نہیں جی یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے دیکھا میری اس بات نے اس کو خاصہ مضمحل کر دیا ہے۔ مگر میں اس کے ساتھ اب زیادہ دیر ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ آخر جب میں دوسری سڑک پر مڑ گیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس پر بھی جب میں اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوا تو ایک بارگی اس نے مجھ کو خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھا۔ اور بلّی کی طرح جھپٹ کر میرا گلہ دبوچ لیا۔ میں نے اس کی گرفت سے چھوٹنے کے لیے اس کے لمبے لمبے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیے اور اس طرح ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ اونچی اونچی عمارتیں خوابیدہ تھیں۔ رات زخمی اژدہے کی طرح رینگ رہی تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے کو بڑے وحشیانہ انداز سے مار رہے تھے۔ نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں سانولے کو گرا کر اس کی گردن پر چڑھ بیٹھا۔ اور بے تحاشا گھونسے مارنے لگا۔ اس نے مجھ کو دو تین گالیاں دیں اور نہ جانے کس طرح شلوار کے

نیفے سے لوہے کی وہ سلاخ نکال لی جس کو ڈکمائی کا ٹھیکرا کہا کرتا تھا۔ اس نے اس سلاخ کو میری کمر میں اڑا کر چاہا کہ گوشت کے اندر اتار دے کہ میں نے اس کو جھٹ سے چھین کر نیچے پھینک دیا۔ میں نے پھر اس کو مارنا شروع کر دیا۔ مارتے مارتے میرا دم پھول گیا تھا۔ آخر اس نے نیچے سے زور کیا اور مجھ کو دور پھینک دیا۔ میں اٹھ کر لوہے کی سلاخ اٹھانے کے لیے لپکا۔ لیکن وہیں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ سانولے سے بھی اٹھ کر اس طرف بڑھا نہیں گیا۔

ہم دونوں بھینسوں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ منہ کھلے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر ہم دونوں اس سنسان سڑک پر بھوتوں کی طرح خوفناک نظر آ رہے تھے۔ ہانپتے ہانپتے میں وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ اور نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

ذرا دیر بعد میں نے دیکھا۔ سانولے برابر بیٹھا میری پیٹھ سہلا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا" ناک سے سانس لو، ناک سے" میری طبیعت اب ذرا سنبھل چکی تھی۔ مجھ سے ایک لفظ نہ کہا گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھ کو گردن جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر وہ بولا:۔

"اٹھ یار، اب عورتوں کی طرح کہاں تک نخرے کرے گا"

اس نے میرا بازو پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اور کندھا تھپ تھپا کر بولا" آؤ جی توجی

کس بل کا ہے۔ مزہ آ گیا۔ پر یار کپڑے پھٹ گئے۔ یہ برا ہُوا؟

میں کچھ اس قدر خفیف ہو رہا تھا کہ اب بھی مجھ سے کچھ کہا نہ گیا۔ مگر وہ اسی طرح بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں وہ خم دار سلاخ موجود تھی، اس کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ "استاد گھبرا گئے کیوں جا رہے ہو ابھی تو تھوڑی بہت رات باقی ہے، چلو کہیں موقعہ لگاتے ہیں۔ پرواہ کا ہے کی۔ جب تو ہے تو کیا غم۔" مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا۔ اور میں اس کے ہمراہ ایک سنسان سڑک پر مڑ گیا۔

کچھ دور تک ہم دونوں یوں ہی چلتے رہے پھر ایک ایسا مقام آ گیا جہاں اندھیرا بہت گہرا تھا۔ سانولے نے ذرا دیر تک چاروں طرف کی آہٹ لی۔ اور ایک بنگلہ کی چار دیواری پر چڑھ گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھ کو اوپر چڑھا لیا۔ یہ پرانی وضع کا بنگلہ تھا اور گھنے درختوں سے اس طرح ڈھکا ہُوا تھا۔ کہ اس کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔

سانولے خاں آہستہ سے پھسل کر نیچے اتر گیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ اندھیرے کا جال اسی طرح پھیلا رہا۔ اچانک رات کے سناٹے میں کتے کے زور زور سے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ اور اس کے ساتھ ہی سانولے خاں کی چیخ ابھری۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں جھٹ سے کود کر سڑک پر آ گیا۔ اور بے تحاشا بھاگنا شروع کر

دیا۔

اس روز کے بعد سے آج تک سانولے خاں کو میں نے نہیں دیکھا خدا معلوم جیل میں ہے یا ابھی تک آوارہ گرد کتوں کی طرح راتوں کو گھومتا پھرتا ہے ؛

○

# شریف آدمی

دوسرے روز وہ بستر پر پڑا دن چڑھے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ باہر صحن پر تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے رضائی کو ایک طرف پھینکا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر انگڑائی لے کر کسل مندی دور کرنے لگا۔ لیکن اس مہینہ کے ہر روز کی طرح، آج بھی اس کے لیے دن کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا اس کی بیوی دالان میں ایک طرف سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ تینوں بچوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صبح ہی صبح وہ باہر میدان میں کھیلنے نکل گئے تھے۔ اس نے سوچا اس وقت بیوی سے بات کرنا مناسب نہیں

اس لیے یہی بہتر ہے کہ پہلے وہ بچوں کو بُلا کر گھر میں لے آئے۔ اور جب ذرا چہل پہل ہو جائے تو پھر کوئی بات چیت کی جائے۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ بیوی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظریں ملیں۔ مگر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

دروازے ہی پر اس کو ڈپٹی صاحب کا ڈرائیور مل گیا۔ اس وقت وہ گہرے نیلے رنگ کی اونی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ڈرائیوروں والی ٹوپی تھی۔ ڈرائیور کوئٹہ کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ لمبا تڑنگا جسم، چہرے پر تازہ خون کی دمک، وردی پہن کر وہ بڑا شاندار نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے سامنے وہ خود کسی کیڑے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے اس کو دیکھتے ہی اپنی بھاری آواز میں کہا۔

"ماسٹر جی السلام علیکم"

وہ حقیر کیڑے سے ایک بارگی، باعزت آدمی بن گیا۔ اس نے لہجہ میں ضرورت سے زیادہ شفقت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "وعلیکم السلام کہو میاں گھر میں سب خیریت ہے۔ بال بچے اچھی طرح ہیں"

وہ کہنے لگا "سب خدا کا شکر ہے۔ ماسٹر جی"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اس کو ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب وہ ناشتہ سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے ہوں گے۔

ڈرائیور تیز تیز قدم اٹھاتا ڈپٹی صاحب کے بنگلہ کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے پر کھڑا اس کو میدان کے اس سرے تک دیکھتا رہا۔ جہاں بہت سے بچے ہجوم کی صورت میں چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے اور ان سے ذرا فاصلہ پر انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک آدمی کیمرہ لیے ان کا فوٹو لے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سارا ہنگامہ کاہے کا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں اس کو سامنے سے بجلی گھر کا مستری آتا ہوا نظر آیا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا۔ جب مستری قریب آ گیا تو اس نے پوچھا

"یہ بچے اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں؟"

وہ کہنے لگا "میں بھی یہی دیکھنے گیا تھا۔ وہ جو کیمرہ لیے صاحب کھڑا ہے وہ بچوں کے سامنے چاکلیٹ۔ ٹافیاں اور پیسے پھینک رہا ہے اور جب بچے ان کو اٹھانے کے لئے جھپٹتے ہیں تو وہ جلدی سے ان کا فوٹو کھینچ لیتا ہے"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "فوٹو کھینچ لیتا ہے کیوں؟"

مستری نے اس کی حیرت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے جواب دیا "پتہ نہیں۔ نہ جانے کیسا آدمی ہے، جب بچے اس کے قریب آ جاتے ہیں تو ان کو ڈانٹ کر دور کر دیتا ہے اور جب وہ چلاتے ہیں تو کھیسیں نکال کر خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔ میں نے بچوں کے برابر کھڑے ہو کر سوچا تھا کہ لاؤ ایک فوٹو ہی کھینچوا ڈالوں تو سالے نے انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دے

کر مجھ کو الگ ہٹا دیا۔"

اس نے جھٹ سے کہا "اور تم نے گالی سن لی ؟"

وہ بولا "ہاں جی اور کیا کرتا ؟"

ماسٹر جی کو جو تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے تھے۔ مستری کی اس بے غیرتی پر بڑا تاؤ آیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ ابھی جا کر اس کو اس بری طرح جھاڑیں کہ اس کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس محلّہ میں مستری کی طرح سب بے غیرت ہی نہیں رہتے ہیں بلکہ کچھ شریف لوگ بھی بستے ہیں۔ مستری جیسے اس بات کو تاڑ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ کہنے لگا۔

"اچھا ہوا۔ اس وقت آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میں کئی روز سے آپ کی تلاش میں تھا۔"

اس نے گھبرا کر کہا "کیوں، خیریت تو ہے ؟"

مستری آہستہ سے بولا "بات یہ ہے کہ ـــــ !" کہتے کہتے وہ رک گیا جیسے وہ اپنی بات کہنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اس جھجک کو محسوس کرتے ہوئے فوراً سہارا دیا۔

"ہاں۔ ہاں کہو کیا بات ہے ؟"

مستری کہنے لگا "بات یہ ہے کہ میری بیوی پچھلے کچھ دنوں سے بڑی بیمار ہے۔ اس کا تو آپ کو بھی پتہ ہوگا۔"

اس نے فوراً لقمہ دیا۔" ہاں! سنا تو ہے کہ تمہارے گھر میں سے آج کل علیل ہیں۔"

مستری بتانے لگا۔" اس لیے کھانے پکانے کی بڑی تکلیف ہے آج کل گھر سے کچھ کھائے پیئے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں۔ بچے الگ ستاتے ہیں۔ گھر والی کا حال یہ ہے کہ وہ تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوتی جا رہی ہے بڑی مشکل سے دن کٹ رہے ہیں۔" انہوں نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا " بھئی تو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور ڈٹ کر علاج کرو۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔"

مستری کہنے لگا۔" علاج تو اس کا ہو رہا ہے۔ مگر اس وقت سوال تو کھانے پینے کا ہے اور گھر کی دیکھ بھال کا ہے۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور حرفِ مطلب پر آ گیا۔" میں نے سوچا آپ کا ہاتھ آج کل ذرا تنگ ہے۔ آپ کی گھر والی، دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آ جاتی ہیں۔ تو اس سے ہم دونوں کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ہرج نہ ہو تو وہ میرے گھر کی ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں۔ کھانا تیار کر دیا کریں۔ کوئی زیادہ کام نہیں ہے۔ اپنا ہی گھر سمجھ کر کام کر دیا کریں۔ دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ میں آپ کو ۲۰ روپے مہینہ دے دیا کروں گا۔ اور اس کے علاوہ ـــــ !" مگر اس نے بات پوری کرنے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

"اور اس کے علاوہ پھٹا پرانا کپڑا دے دیا کروں گا۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا۔" غصہ اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی "مستری خدا نے ہم پر وقت ڈالا ہے تو تم بھی جو چاہو کہہ لو۔ اللہ اللہ! اب یہ وقت آ گیا ہے کہ ماسٹر فرزند علی کی بیوی، تمہارے گھر کے برتن مانجھے۔ ماما گیری کرے۔ واہ مستری۔ واہ خوب تم نے ہمدردی کی، خوب تم نے ہمسایہ کا حق ادا کیا۔"

اس کی آواز اور بھرا گئی اور مستری کے جواب کا انتظار کئے بغیر غصہ سے کانپتے ہوئے اپنے گھر میں چلا گیا۔ مستری ہکا بکا ان کو کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

گھر میں جا کر ماسٹر فرزند علی نے دیکھا کہ بیوی اسی طرح دالان کے کونے میں سر جھکائے مضمحل بیٹھی تھی۔ وہ بے چینی سے کمرے کے اندر جا کر، دیوانے کتے کی طرح ادھر ادھر تیزی سے گھومتا رہا۔ پھر دالان میں آ گیا اور بیوی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں نے کہا سن رہی ہو شبن کی اماں۔ آئندہ اس مستری کے بچے کے دروازے پر تم نے قدم رکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ خبردار جو اب تم اس کے گھر گئیں۔ سالا کمینہ، بچوڑا کہیں کا۔"

وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا، پھر کمرے کی طرف چل دیا۔ بیوی نے ٹوک کر کہا۔ "کیوں آخر ہوا کیا؟" وہ رک کر کہنے لگا۔

"کچھ نہیں۔ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ سالا ابھی مجھ سے ملا تو کہنے

لگا کہ تم اپنی بیوی کو میرے یہاں کھانا پکانے پر رکھ دو۔ حد ہو گئی حرام زدگی کی۔"

وہ بگڑ کر بولی۔ "سور کا بچہ اس کی ہمت کیسے ہو گئی۔ ابھی ابا جان سنئے۔ تو یہی کہیں کہ پاکستان جا کر تم دونوں نے خاندان کا خوب نام روشن کیا۔ پنشن کار صاحب کی بیٹی اب منتریوں کی خادمہ بنے گی۔ ان رذیلوں کی ٹہل چاکری کرے گی خدا اس گھڑی کو موت نہ دے دے۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت کو رونے لگی۔ فرزند علی بھی اداس سا کمرے میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ گھر پر ایک سناٹا چھا گیا۔ دھوپ دیوار سے پھسل کر اب دالان تک آ گئی تھی۔ اس میں گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ فرزند علی بے حد اداس بیٹھا تھا۔ باہر دالان سے ابھی تک اس کی بیوی کی دبی دبی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ فضا اتنی بوجھل اور بے کیف تھی کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک گھر کا دروازہ شور کرتا ہوا تیزی سے کھل گیا۔

اس کے تینوں بچے صحن میں آ کر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے۔ گھر کا سناٹا شکست ہو چکا تھا۔ اور زندگی کے ہنگامے اداس فضا سے نکل کر بیدار ہو گئے تھے۔ جب بچوں کا شور زیادہ بڑھ گیا تو وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں لڑکے چھوٹی بچی کے ہاتھ سے کچھ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بچی جھکی ہوئی زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کو سینے سے چمٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ

سے دونوں بھائیوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی، جو بری طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ اب اس کی بیوی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ڈانٹ کر ان کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر وہ ان کے نزدیک چلی گئی۔ اس نے دونوں کو زبردستی پکڑ کر الگ ہٹا دیا۔ بچی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں پر، بالوں پر، ہاتھ پیروں پر مٹی بھر گئی تھی۔ اس نے اب رونا بند کر دیا تھا۔ پھر اس نے خوشی سے ہنس کر اپنا ہاتھ نکالا اور بھائیوں کی طرف بڑھا کر کہا "لو یہ رہی" اور اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ مگر اس کا ہاتھ خالی تھا۔ لمحہ بھر تک تو وہ اپنی ہتھیلی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر منہ بسور کر رونے لگی۔ اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہیں مٹی میں لوٹ گئی۔ دونوں لڑکے خوشی سے تالیاں بجا کر ناچنے لگے "اچھا ہوا، لے چلی گئی نا، اب تو ہم بھی نہیں دیں گے۔" انہوں نے اپنی جیب کے اندر سے خوب صورت کاغذوں میں لپٹی ہوئی چاکلیٹ نکالی اور ماں کے پاس سے دور بھاگ گئے۔ ماں پوچھنے لگی۔

"ارے کم بختو! یہ تو بتاؤ، اس کے ہاتھ میں تھا کیا؟"

ایک بچہ کہنے لگا "چونی تھی، صاحب نے ہم سب کو دی تھی۔ یہ اکیلی ہی اس کو ہڑپ کر لینا چاہتی تھی، اب کھو گئی، اچھا ہوا۔" ماں نے جلدی سے کہا "تو وہ گئی کہاں؟" اور پھر بچوں کی بات نظر انداز کر کے بچی کے پاس پہنچ گئی اور نظریں گاڑ کر ادھر ادھر چونی کو تلاش کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد بچی کے پاؤں تلے

اس کو مٹی میں دبی ہوئی چونی نظر آ گئی۔ اس نے چپکے سے اس کو اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا اور بچی کو اٹھا کر چمکارنے لگی۔ جو مٹی میں لتھڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ دروازے سے لگا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ کل دن بھر کی بھوک جو رات کے ہنگامہ سے بجھ گئی تھی۔ پھر سلگنے لگی تھی۔ فرزند علی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اب وہ کہاں جائے، کیا کرے؟ باہر دالان میں بچوں کے چلانے اور اس کی بیوی کے کوسنوں کی آوازیں سنائی پڑ رہی تھیں اور وہ ان آوازوں سے بے نیاز صرف ایک ہی آواز کو سن رہا تھا۔ بھوک، بھوک، بھوک جو گھڑی کے پنڈولم کی طرح کھٹاک، کھٹاک، کھٹاک، ہر ہر پل اور ہر ہر سیکنڈ کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

اسی لمحہ اس کی بیوی کمرے کے اندر آ گئی "لیجئے، یہ ذرا سے کچالو کھا کر پانی پی لیجئے، کچھ سہارا ہو جائے گا۔" اس نے گھوم کر دیکھا، بیوی کے ہاتھ میں رکابی تھی۔ جس میں ابلے ہوئے آلوؤں کے تھوڑے سے قتلے تھے، جن پر نمک مرچ چھڑکا ہوا تھا۔ اس نے بیوی سے نظریں ملائے بغیر چپ چاپ رکابی ہاتھ میں لے لی۔ بیوی باہر چلی گئی۔ اس نے آلو کا ایک قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا لیکن ابھی اس نے چند ہی قتلے کھائے تھے کہ باہر آنگن میں اس کے خالہ زاد بھائی کی آواز سنائی دی۔ اس نے رکابی اٹھا کر دیوار کے پاس ایک کونے

میں چھپادی اور جلدی جلدی منہ پونچھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اندر آگیا۔ فرزند علی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت عرصہ بعد آیا تھا۔ لہذا فرزند علی ہر ایک کے متعلق تفصیل سے پوچھ رہا تھا۔ آخر جب وہ اٹھ کر چلنے لگا۔ تو فرزند علی نے اس کو تکلفاً روکتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو میاں، چائے تو پیتے جاؤ۔"

شاید اس کو ابھی کچھ دیر اور باتیں کرنا تھیں۔ اس لیے وہ ٹھہر گیا۔ فرزند علی نے اونچی آواز میں بیوی سے کہا "سن رہی ہو۔ تم نے سمیع کے لیے چائے تیار نہیں کی۔ کیا کہیں گے کہ بھائی کے یہاں گیا تھا۔ چائے تک کو نہ پوچھا۔" اس نے خواہ مخواہ خوش مزاج بننے کی کوشش کی۔ اسی وقت دروازے کی آڑ سے اس کی بیوی کا چہرہ نظر آیا وہ ناراضگی سے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے گردن موڑ لی۔ اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ آخر جب وہ پھر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا تو فرزند علی نے اس کو روک کر کہا "چائے تو پیتے جاؤ۔ نہ معلوم اتنی دیر کیوں ہو گئی" اور خود اٹھ کر باہر دالان میں آگیا۔ بیوی کے قریب جا کر اس نے کہا "چائے کا تو بندوبست کر دو سمیع کو تو تم جانتی ہی ہو، خالہ سے جا کر کہے گا۔ صاحب فرزند علی بھائی کے یہاں گیا تھا۔ ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔"

بیوی جل کر بولی "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بچی کی جوتی لے کر تو آلو منگائے

تھے۔ میرے پاس کچھ آپ نے جمع کرا دیا ہے کہ چائے کا انتظام کردوں۔"

فرزند علی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا، پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا "مستری کے یہاں سے لے آؤ۔"

وہ حیرت سے بولی "مستری کے یہاں سے؟ آج ہی تو آپ نے منع کیا تھا۔ میں تو اس کے یہاں اب تھوکنے کی بھی نہیں۔" وہ اس کو سنانے لگا۔ "سنو تو، کہتا ہم جلدی ہی تمہارا سارا قرضہ ادا کر دیں گے اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں۔ مسلم اسکول کے سیکرٹری نے آج مجھ کو بلایا بھی ہے۔" مگر وہ آمادہ نہ ہوئی "وہ تو روز بلاتا ہے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔" پھر اس نے خوشامد کے سے انداز میں کہا "خدا کے لیے مجھ کو وہاں نہ بھیجئے۔ مجھ کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ پھر آج تو آپ سے اس کا جھگڑا بھی ہو گیا ہے۔"

فرزند علی خاموش ہو کر انگلی سے اپنے بالوں کو کریدنے لگا۔ اتنے میں سمیع نکل کر باہر دالان میں آ گیا۔ کہنے لگا "نہیں بھائی صاحب آپ چائے کا تکلف نہ کیجئے؛ خواہ مخواہ بھابی کو تکلیف ہو گی۔" اور وہ روٹھا ہوا سا گھر سے باہر چلا گیا۔ فرزند علی نے اس کو روکا بھی، مگر وہ واپس نہ لوٹا۔ اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

فرزند علی جب پھر کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ رکابی خالی پڑی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں بچوں نے اس کو صاف کر دیا تھا۔ غصہ سے اس کی آنکھوں

میں خون اُتر آیا۔ بچوں کو اس کا پہلے ہی علم تھا، اس لیے وہ گھر سے غائب ہو چکے تھے۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں رکابی اٹھا کر باہر آنگن میں پھینک دی۔ اور اپنے ٹرنک کو کھول کر تمام کپڑے الٹ پلٹ کر رکھ دیئے۔ پھر اس نے سرج کی شیروانی نکالی۔ اس کو پہنا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ بیوی نے اس کو باہر جاتے ہوئے دیکھا، مگر شیروانی کو دیکھ کر اس کو تعجب ضرور ہوا۔ اس لیے کہ فرزند علی، اس شیروانی کو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا اور اس کو بڑی حفاظت کے ساتھ رکھتا تھا۔ جب کبھی وہ اس کو پہنتا تو بیوی کے سامنے اس طرح اِترا اِترا کر چلتا کہ اس کا ہر انداز چیخ چیخ کر کہتا "دیکھو کیسا جچ رہا ہوں کیا ٹھاٹھ ہیں اپنے"۔ بلکہ ایک بار وہ اپنے اسکول کی کسی تقریب سے لوٹ کر آیا، تو بار بار اس کو ہنسی آ رہی تھی۔ بیوی نے پوچھا تو کہنے لگا: "آج تو بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسکول کے جلسے میں جو بھی آتا، وہ مجھ کو ہیڈ ماسٹر سمجھتا پہلے مجھ سے ہی بڑھ کر مصافحہ کرتا۔ ہیڈ ماسٹر جل بھُن کر رہ گیا۔" وہ جانتی تھی۔ کہ یہ سب کچھ شیروانی کی شان میں قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ مگر آج اس شیروانی کو کیوں نکالا گیا۔ پھر اسے خود ہی خیال آ گیا۔ کہ مسلم اسکول کے سیکرٹری سے ملنے گئے ہوں گے۔ اور اس احساس نے اس کو امید اور ناامیدی کے دوراہے پر لا کر چھوڑ دیا۔

فرزند علی گھر سے نکل کر پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی دکان

پر پہنچا۔ آنے کو تو وہ اس بازار میں آگیا مگر کسی دکان میں داخل ہونے کی اس کو ہمت نہ ہوئی۔ آخر وہ ایک دکان پر، جہاں بالکل سناٹا تھا۔ اللہ کا نام لے کر اندر چلا گیا۔ دکان میں الماریوں کے اندر ہنگروں پر، دیواروں پر ہر جگہ انگریزی وضع کے لباس ٹنگے تھے بعض تو ایسے اعلیٰ درجے کے سلے ہوئے تھے کہ اس کو اپنی شیروانی بے حد گھٹیا معلوم ہونے لگی۔ دکان دار اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

"کیا چاہیئے؟" پھر اس نے خود ہی کہا "کوٹ دکھاؤں، کوئی سوٹ؟ ہمارے یہاں جو نیا مال آیا ہے اس میں تو ایسے ایسے کوٹ ہیں کہ نیا اس کے سامنے شرما جائے۔ خاص امریکہ کے تیار کئے ہوئے کپڑے ہیں۔"

فرزند علی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ کے یہاں شیروانیاں نہیں ہوتیں؟"

دکان دار مسکرانے لگا۔ "نہیں صاحب شیروانیاں کیسے ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کپڑے تو امریکہ سے آئے ہیں۔"

فرزند علی کہنے لگا۔ "شیروانی اور اسی قسم کے کپڑے آپ اپنے یہاں سے خرید لیا کیجئے۔"

دکان دار اونچی آواز میں بولا :-

"ارے صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ امریکہ میں تو ہر سیزن میں کپڑے آوٹ آف ڈیٹ ہو جاتے ہیں۔ وہاں ہر سال فیشن بدلتا ہے۔ نئے کے نئے

کپڑے ایک دم کنڈم کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تو لوگ دس دس سال ایک کپڑے کو رگڑتے ہیں۔ اب اس اپنی شیروانی کو دیکھ لیجئے۔ سات آٹھ سال سے کم کی کیا ہی ہو گی۔ ایسے کپڑے لے کر دکان پر لگائے جائیں تو آپ ہی بتائیے کون ان کو خریدنے آئے گا۔" فرزند علی جل بھن کر رہ گیا۔ اپنی شیروانی کی وہ اس قدر ہتک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی اثنا میں دکان کے اندر ایک گاہک آ گیا۔ دکان دار اسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لہٰذا فرزند علی پیچ و تاب کھاتا ہوا دکان سے باہر آ گیا۔ کسی اور دکان پر جانے کی اس کو ہمت نہ پڑی۔

شام کو جب واپس لوٹا تو گھر میں اندھیرا پڑا تھا۔ بچے چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ بیوی حسب معمول ان کو کوسنے دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ جا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ آخر تھوڑی دیر بعد بیوی نے آ کر پوچھا:۔

"سیکرٹری صاحب سے کچھ بات ہوئی؟"

وہ اس کو مایوس نہ کر سکا۔ "پرسوں پھر بلایا ہے۔"

وہ بولی۔ "تو کچھ امید ہے؟"

"ہاں۔ ہاں، کیوں نہیں؟" اس نے جھوٹ موٹ کی امید بندھوا دی۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اس نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور مضمحل سا بستر پر لیٹ گیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آخر وہ اٹھ

کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر تک بے چینی سے دالان میں ٹہلتا رہا۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کمرے میں آکر شیروانی پہنی۔ بڑے لڑکے کو اٹھایا وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ کیسٹر آئل کی بوتل اس کو دی اور اپنے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔ بیوی نے خامشی سے سب کچھ دیکھا مگر وہ کچھ بولی نہیں چپ چاپ لیٹی رہی۔

باہر آکر وہ سیدھا محلّے کے پرچونئے کی دکان کی طرف چل دیا۔ سردی کی وجہ سے سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ دکان پر اس وقت سوائے دکان دار کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ فرزند علی کہنے لگا۔

"خان صاحب تم نے ابھی تک دوکان نہیں بڑھائی۔"

وہ کہنے لگا "بس بند کرنے ہی جارہا تھا۔ آج سردی بھی کچھ زیادہ ہے۔"

فرزند علی نے کہا۔ "ہاں آج سردی زیادہ ہے، تمہارا کیا ہے بھائی، تم تو سنا ہے کہ آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔" وہ خواہ مخواہ اس سے بے تکلفی برتنے لگا۔

"صحت بھی ماشاء اللہ ادھر اچھی ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے خان صاحب تم پر تو پھر سے جوانی آگئی ہے۔" فرزند علی یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ دکان دار بھی مسکرا دیا۔

"ماسٹر جی کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچوں کا پیٹ پال لیتا ہوں۔"

فرزند علی جھٹ سے بولا" ہاں بھئی تمہاری ہمت پر آفرین ہے۔ ایکیلے دم پہ اتنا بڑا ٹبر سنبھالے ہوئے ہو" پھر اس نے فوراً ہی بات کا رخ بدل کر کہا" ذرا ایک بوتل مٹی کا تیل تو دینا" اور لڑکے سے بوتل لے کر اس کی طرف بڑھا دی۔

دوکان دار نے بوتل میں تیل بھر دیا۔

فرزند علی نے بوتل لڑکے کو دے کر کہا" اچھا تم چلو۔ امی سے کہنا میں ابھی آتا ہوں" لڑکا گھر کی طرف چل دیا۔ وہ دوکان دار سے کہنے لگا" اس کے پیسے کل آجائیں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ۔" دکان دار نے فوراً اس کو ٹوک دیا۔

"ماسٹر جی اس طرح کام نہیں چلے گا"

وہ زبردستی ہنسنے لگا" اماں اس طرح بھی کام چلتا ہے" اس نے پھر بات بدلنے کی کوشش کی" ہاں تو ـــ" دکان دار نے پھر اس کو ٹوکا۔

"نہیں جی! قرض میں نے بالکل بند کر دیا ہے۔ لڑکے کو بلا لیجئے" اس نے فرزند علی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر واپس بلا لیا۔ اس سے بوتل لی اور کنستر میں تیل انڈیل کر خالی بوتل اس کو تھما دی۔ بچہ سہما ہوا سا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ فرزند علی جھینپ مٹانے لگا" خان صاحب! بعض وقت تو تم ایسی بے مروتی پر اتر آتے ہو کہ بالکل مارواڑی معلوم ہونے لگتے ہو۔ اماں تمہارے پیسہ لے کر یہاں سے بھاگنے سے تو رہا"

مگر خان صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور اٹھ کر دوکان بند کرنے کے واسطے

قفل نکالنے لگا۔ فرزند علی ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دکان سے ہٹ آیا لڑکے کو اس نے گھر بھیج دیا۔ اور خود دودھ والے کی دوکان کی طرف چل دیا۔ اس لیے کہ گھر کے اندھیرے سے اس کو وحشت ہو رہی تھی۔

دودھ والے کی دکان پر ایک دھندلی سی لالٹین جل رہی تھی اور کئی آدمی بیٹھے دودھ پی رہے تھے۔ فرزند علی بھی وہاں پہنچ گیا۔ "کہو بھئی پہلوان کیا حال ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "ماسٹر صاحب سب خدا کا شکر ہے۔"

"ہاں میاں، ہر حال میں اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے وہ بڑی شان والا ہے۔"

دودھ والا اپنی بات کہہ کر فوراً کام میں مصروف ہو گیا۔ فرزند علی وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے کچھ دیر بعد اٹھ کر چل دیئے۔ اب دکان پر سناٹا ہو گیا تھا۔ پہلوان کے علاوہ دوکان میں سامنے پلنگ پر ایک شخص رضائی اوڑھے پڑا سو رہا تھا۔ ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر دکان دار کہنے لگا۔

"ماسٹر صاحب، اب کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔"

وہ بولا۔ "ہاں بھئی، برکت رہے بھی تو کیسے؟ لوگوں کی اب وہ نیتیں نہیں رہیں۔ وہ ایمان نہیں رہے۔"

دکان دار کہنے لگا۔ "بالکل ٹھیک کہا آپ نے، یہی حال ہو رہا ہے۔" پھر وہ دکان داری کے خراب ہونے کا رونا رونے لگا۔ "اب کیا بتاؤں آپ سے کہ کس طرح دکان داری چلتی ہے۔ لوگوں کو کھانے کو تو میسر نہیں۔ بے چارے

دودھ کہاں سے پئیں۔"

فرزند علی نے باتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔"عجیب زمانہ آیا ہے ایسا تو کبھی دیکھا اور نہ خدا دکھائے۔ایک یہ وقت ہے،ایک زمانہ تھا،خدا بخشے والد مرحوم زندہ تھے۔گھر پر بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔گابھن ہوئی تو گاؤں بھجوادی۔دوسری بلوالی۔دونوں وقت میں ۵۳ سیر تک دودھ دیا ہے ہماری بھینسوں نے۔اباجان زبردستی سر پر سوار ہو کر دودھ پلواتے تھے جہاں ان کی نظر چوکی اور میں نے جھٹ سے کٹورا اوندھا کر دیا۔اماں تم کو تعجب ہوگا۔ہمارے آنگن کا فرش کچا تھا۔جہاں میں دودھ ڈالتا تھا وہاں کی زمین ایسی چکنی ہو گئی تھی کہ نچوڑو تو چکنائی ٹپک پڑے۔"پہلوان کہنے لگا۔

"کیوں نہیں ماسٹر صاحب،کیوں نہیں۔اس دودھ کی کیا بات تھی۔"

فرزند علی جیسے اس کو مرعوب ہی کرنے پر تلا ہوا تھا کہنے لگا۔"سستا زمانہ تھا۔دو روپے میں نوکر مل جاتا تھا۔گھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی درجن بھر ملازم ہوں گے۔پوری پلٹن کی پلٹن تھی۔اس خیال سے کہ ابا جان ہم کو دودھ نہ پلا دیں۔چپکے چپکے ان کو گلاس بھر بھر کر پلا دیتے تھے۔سالے پھول پھول کر ملکھنا ہاتھی ہو گئے تھے۔"

پہلوان نے بات کا جواب نہیں دیا۔اس لیے کہ دودھ نکالنے کی ڈونگی اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔وہ اس کو اٹھانے کے لیے دوسری

طرف جھک گیا۔ فرزند علی کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اچانک اس کی نظر لکڑی کے اس ڈبے پر پڑ گئی جو کھلا ہوا تھا۔ اس میں کچھ ریزگاری، چند روپے اور ایک دس والا نوٹ پڑا تھا۔ فرزند علی نے لمحہ بھر تک اس طرف دیکھا اور پھر بلّی کی طرح چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر اس نے نوٹ اٹھا لیا۔ اسی وقت دودھ والا پہلوان دودھ کی دونگی اٹھا کر اپنی جگہ آ گیا۔ فرزند علی نے گھبرا کر نوٹ شیروانی کی نچلی جیب میں ڈال لیا۔

دودھ والے نے اس کے چہرے کا رنگ متغیر دیکھا تو کہنے لگا "کیوں ماسٹر صاحب کیا ہو گیا؟" فرزند علی کہنے لگا "کچھ نہیں بھئی، بیٹھے بیٹھے پیٹ میں مروڑ سی معلوم ہوئی۔ خدا خیر کرے۔" ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر چلنے لگا۔ پہلوان کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ گلہ سے روپے نکال کر گننے لگا۔ پھر خود ہی بولا "یہ دس کا نوٹ کیا ہو گیا" فرزند علی اور گھبرا گیا۔ اس نے سوچا۔ اب یہاں سے کھسک جانا ہی بہتر ہو گا۔ اس نے اپنے خالی پیٹ کو خواہ مخواہ زور سے دبوچ لیا۔ "بھئی بڑی تکلیف ہو رہی ہے میں تو چلا۔" دودھ والے نے جیسے سنا ہی نہیں۔ نوٹ کے غائب ہو جانے سے وہ بے حد پریشان ہو رہا تھا۔

اتنے میں پلنگ پر لیٹا ہوا آدمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پوچھنے لگا۔

"چاچا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

وہ کہنے لگا "ایک دس کا نوٹ جانے کہاں چلا گیا" اس کا بھتیجا بھی اٹھ

کر وہاں آگیا۔ فرزند علی اب دکان سے آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

ابھی چند قدم ہی وہ چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ کر کہا "ذرا ادھر آنا جی۔" فرزند علی نے گھوم کر دیکھا۔ پہلوان کا بھتیجا اس کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا:۔

"چاچا نوٹ یہ رہا۔"

اس نے فرزند علی کی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا۔ وہ ہوا یہ کہ گھبراہٹ میں اس نے نوٹ اس طرح رکھا تھا کہ جیب میں سے اس کا ایک سرا دکھائی دے رہا تھا۔ دکان دار کو فرزند علی پر ایک دم غصہ آگیا۔ وہ آپے سے باہر ہو کر دکان سے نیچے کود پڑا۔ اور جاتے ہی اس نے فرزند علی کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ مگر وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کی آواز اس قدر بھرائی ہوئی تھی کہ منہ سے بول نہیں پھوٹ رہا تھا۔ لیکن پہلوان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دینے لگا۔ فرزند علی کہنے لگا:۔

"اماں گریبان تو چھوڑو۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پہلوان نے اس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا۔ اور چیخ کر بولا۔ "سالے شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے۔" فرزند علی نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے

کہا۔" اچھا میرا گریبان تو چھوڑو۔ شیروانی کا کالر خراب ہو جائے گا۔" دودھ والے نے اس زور کا جھٹکا دیا کہ شیروانی کندھے پر سے پھٹ کر کمر تک آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر اس کو مارنا شروع کر دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"سالے چور! مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔ تو اسی پیسے اتنی رات کو دکان پر آیا تھا۔"

فرزند علی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔"تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ تمہارا نوٹ مل گیا۔ اب مجھ کو چھوڑ دو۔ تم نے اتنا مار بھی لیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟" مگر پہلوان ذرا بھی متاثر نہ ہوا کہنے لگا۔

"میں تجھ کو تھانے لے جاؤں گا۔ سالے تجھ کو یوں نہیں چھوڑوں گا۔"

شور سنکر پاس پڑوس کے بہت سے لوگ نکل کر وہاں اکٹھا ہو گئے پہلوان نے اب اس کی قمیص کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ فرزند علی بار بار کہہ رہا تھا کہ "میری بات تو سنو۔" اتنے میں ایک شخص آ گیا۔ جو کسی سرکاری محکمہ میں ملازم تھا اس کو فرزند علی کی حالت پر ترس آ گیا۔ اس نے پہلوان سے ڈانٹ کر کہا۔

"گریبان تو چھوڑ دو۔"

پہلوان نے گریبان چھوڑ دیا۔ وہ آدمی فرزند علی سے کہنے لگا "پہلے آپ بتائیے کہ بات کیا تھی؟"

فرزند علی کہنے لگا" صاحب میں شریف آدمی ہوں۔ یہ بدمعاش لوگ

ہیں۔ خواہ مخواہ مجھ پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھئے میری اتنی اعلیٰ شیروانی بھی پھاڑ ڈالی اور برابر مار پیٹ رہے ہیں۔" وہ مسکین بنا ہوا جھوٹ موٹ کی صفائی پیش کرنے لگا۔ "خدا کی قسم میں نے اس کا نوٹ دیکھا تک نہیں" پہلوان کا بھتیجا ایک دم چیخ کر بولا :-

"او سور کے بچے جھوٹے۔ ابھی تو تیری جیب سے نوٹ نکالا ہے۔"

اس کے جھوٹ بولنے پر پہلوان کو پھر غصہ آ گیا۔ وہ اس کو موٹی موٹی گالیاں دینے لگا۔ اس نے پھر جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور فرزند علی کے حمایتی کی طرف آنکھیں نکال کر بولا۔ "دیکھئے بابو جی آپ اس معاملے میں نہ بولیے ورنہ بات بڑھ جائے گی۔"

بے چارے بابو جی پہلوان کی خون خوار آنکھوں سے سہم کر رہ گئے وہ بات کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اور مجمع سے کھسک کر پیچھے ہو گئے۔ پہلوان کو اس بات کی ضد تھی کہ وہ فرزند علی کو تھانہ لے جائے بغیر باز نہیں آئے گا۔ اتنے میں کسی نے ہجوم میں سے چیخ کر کہا۔

"پہلوان تھانہ لے جا کر کیا کرو گے۔ وس بیس جوتے مار کر چھوڑ دو۔ سالا بال بچے والا ہے، ہر تو جیل چلا جائے گا۔ وہ بے چارے بھوکے مریں گے"

پہلوان اس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ اتنے میں اسی آدمی نے جس نے یہ مشورہ دیا تھا، جوتا اتارا اور دھڑا دھڑ جوتے مارنا شروع کر دیئے۔

فرزند علی چیختا رہا۔ "میری بات تو سنو، میں شریف آدمی ہوں" مگر وہاں کون اس کی سنتا تھا۔ وہ قسمیں کھاتا رہا۔ اپنی بے گناہی ثابت کرتا رہا۔ مگر جوتے دھڑا دھڑ پڑتے رہے۔ پھر اس آدمی نے ہانپنے کے سے انداز میں ہاتھ روک کر کہا۔ "اچھا اب اس کو جانے دو۔" اور وہ فرزند علی کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کی بھیڑ میں سے باہر نکال لایا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا:۔

"کہو استاد کیسا صاف بچوا دیا۔ ورنہ ابھی حوالات میں ہوتے۔ تم شریف آدمی ہو۔ اسی کو غنیمت جانو۔"

فرزند علی کو اس پر بے حد غصہ آیا مگر وہ کرتا بھی کیا۔ چپ چاپ شریف آدمی کی طرح اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر میں جا کر اس نے دیکھا کہ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور بیوی جاگ رہی تھی۔ اس کی پھٹی ہوئی شیروانی اور بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر بولی۔

"ہے ہے کیا ہو گیا۔ کسی سے لڑ کر آئے ہو۔ شور تو میں نے بھی سنا تھا۔"

وہ خشمگیں نظروں سے گھور کر بولا۔ "کچھ نہیں ہوا۔"

وہ اصرار کرنے لگی۔ "کچھ تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟"

وہ بگڑ کر بولا۔ "یہ روشنی کمرے میں کیسی ہو رہی ہے تم پھر اس خبیث منشی کے یہاں گئی تھی۔ میں نے ہزار دفعہ سمجھایا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ مگر تم ذات کی ڈومنی ہو ڈومنی۔ کمین خصلت کہیں جا سکتی ہے۔" وہ اس پر برس پڑا۔

وہ خوشامد کے سے انداز میں بولی۔" اس کے یہاں کب گئی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد، یہ بچے سب جاگ اٹھے تھے۔ ان کو بہلانے کے لیے کلب کی طرف لے گئی تھی۔ وہاں آج کوئی بڑا جشن تھا۔ بڑی بھاری دعوت تھی خوب روشنی ہو رہی تھی۔ بینڈ بج رہا تھا۔ عورتیں اور مرد مل مل کر ناچ کر رہے تھے" وہ بچوں کی طرح ایک ایک بات تفصیل سے مزا لے لے کر بتا رہی تھی "وہیں کوڑے کے بڑے ٹین میں سے یہ بچے نہ جانے کیسے ایک موم بتی ڈھونڈ لائے۔ اسی کو میں نے جلا دیا۔" فرزند علی خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا اور فرش پر پڑے ہوئے ایک ٹوسٹ کے ٹکڑے کو دیکھ کر بولا:-

"اور وہیں کوڑے گھر سے، لوگوں کے بچے کھچے کھانے کو بھی اٹھا لائیں میں کہتا ہوں، تم کیوں میری عزت کے پیچھے پڑی ہو۔ دنیا میں ایسی بھی عورتیں ہیں۔ جن پر سات سات وقت کا فاقہ پڑتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور ایک تم ہو۔"

بیوی کی .... چوری پکڑ لی گئی تھی۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔" تو آخر میں کیا کروں ان حرام زادوں نے میری بوٹیاں نوچنی شروع کر دی تھیں۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ فرزند علی کو اس کا اس طرح رونا بہت برا لگا۔ اس نے غصہ میں اس کے بال پکڑ کر اس زور سے کھینچے کہ وہ فرش پر منہ کے بل گر پڑی۔ فرزند علی اس وقت واقعی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی کمر پر

اور پیٹھ پر جوتوں کی ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ شور سن کر بچے بھی جاگ اٹھے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ فرزند علی نے چیخ کر کہا "چپ ہو جاؤ، سور کے بچو"۔ مگر دو سور کے بچے تو ڈانٹ سے خاموش ہو گئے۔ البتہ سور کی بچی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ فرزند علی نے جھنجلا کر اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا۔ کہ وہ لڑھکتی ہوئی بستر کے دوسرے کنارے تک چلی گئی اور خوف زدہ ہو کر اس کو دیکھنے لگی۔ فرزند علی لمحہ بھر تک گھورتا رہا۔ پھر جیسے اس کو خود ہی اپنی حالت پر ترس آگیا۔ وہ وحشیوں کی طرح پلٹا اور دیوار پر سر دے مارا "اور لو اور لو، اور لو"۔ وہ دیوانوں کی طرح دیوار پر ٹکریں مارتا رہا۔ پیشانی پر سے اس کا سر پھٹ گیا۔ اور خون بہتا ہوا اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ دھندلی روشنی میں خون سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ بے حد خوف ناک نظر آرہا تھا۔ بچے چیخ کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ لیکن فرزند علی اس طرح زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے پیر کانپنے لگے تھے اور پھر وہ نڈھال ہو کر فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں گھور اندھیرا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہے۔ وہ دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہو چکا تھا اور پیٹ میں آگ سی لگ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اندھیرے میں ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ مگر اس کو سوائے اس کے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ سب سو رہے ہیں۔ وہ چپ چاپ باہر چلا گیا۔

کلب میں سناٹا ہو چکا تھا۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ دیوار کے سائے میں کچھ کتے لڑ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ کتے اس کو دیکھ کر غرائے اور پھر وہاں سے بھاگ گئے۔

اس کے چاروں طرف کھانوں کی خوشبو ابھر رہی تھی۔ اس نے کئی بار تیز تیز سانس بھر کے نتھنوں میں ان کی خوشبو کو محسوس کیا۔

ایک بار اس نے چاروں طرف چوروں کی طرح دیکھا اور پھر خود ہی مسکرا دیا۔ بھلا اس وقت اتنی رات گئے یہاں کون آنے لگا۔ اس نے جھک کر روٹی کے کچھ بچے کھچے ٹکڑے اٹھائے اور ان کو جلدی جلدی کھانے لگا۔

اچانک اس کو کوڑے کے بڑے ٹین کے پاس ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ یہ اس کی بیوی کی آواز تھی۔ دونوں لمحہ بھر تک خاموش کھڑے رہے۔ پھر اس نے ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھا کر کہا "کھاؤ مزیدار ہے"۔ بیوی نے چپ چاپ ہاتھ بڑھا کر اس کو لے لیا۔

○

# سیاہ فام

سڑک کے ایک موڑ سے کئی آوارہ کتے نکل کر زور زور سے بھونکنے لگے اس نے جھنجھلا کر کتوں کو موٹی سی گالی دی۔ سامنے نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک سایہ کار کی تیز روشنی میں لہرایا۔ اندھیرے میں ایک دردناک انسانی چیخ ابھری، کار اچانک زور سے اچھلی، اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے جا کر بڑے زور سے ٹکرا گئی۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ وہ اپنی فوراً دیر تک ڈھکا بکا سا اسٹرنگ پر بت بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ نکل کر کار سے باہر آ گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ کوئی پڑا کراہ رہا تھا۔ وہ سہما ہوا اس کے پاس گیا تاروں کی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا، ایک لمبا چوڑا آدمی اوندھے منہ

لیٹا تھا۔ اس کے چاروں طرف خون ہی خون پھیلا تھا۔ دور دور تک کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا تھا اور میلوں تک پھیلی ہوئی سنسان سڑک، موقعہ غنیمت تھا۔ درانی نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کو گھسیٹ کر سڑک کے کنارے کیا اور جلدی سے کار کے اندر جا کر اس کو اسٹارٹ کرنے لگا۔ مگر کار اسٹارٹ نہ ہوئی۔

جب وہ ہر کوشش کے باوجود بھی کار اسٹارٹ نہ کر سکا تو مجبوراً اتر کر نیچے آ گیا۔ ایک بار وہ پھر ڈرتے ڈرتے خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا۔ اب اس نے کراہنا بند کر دیا اور آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ درانی اس کے قریب وحشت زدہ سا کھڑا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ کار چھوڑ کر وہاں سے پیدل ہی بھاگ کھڑا ہو۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس لیے کہ کار کی موجودگی اس کے خلاف پورا پورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد سڑک پر موٹر کی روشنی جھلکتی نظر آئی۔

ذرا ہی دیر بعد ایک ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنے حواس درست کئے۔ آگے بڑھ کر ٹرک کو رکوایا۔ اور ڈرائیور کے قریب جا کر کہنے لگا۔

"ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے مجھ کو فوراً تھانے تک لے چلو۔"

ٹرک کے اندر ڈرائیور کے ہمراہ ایک آدمی اور بیٹھا تھا۔ دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ان کے سامنے خون میں لتھڑا ہُوا ایک کالا کلوٹا آدمی پڑا تھا۔ ذرا آگے بڑھ کر ایک موٹر کھڑی تھی جس کا اگلا حصّہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر پوچھا۔

"بڑا زبردست ایکسیڈنٹ ہُوا ہے۔ کیا ایک دم سامنے آ گیا تھا؟"

درانی تیزی سے بولا۔ "باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ مجھ کو جلدی لے چلو۔"

وہ جھٹ سے ٹرک پر چڑھ گیا اور ٹرک شور کرتا ہُوا آگے بڑھ گیا تھانہ وہاں سے کوئی میل بھر پر تھا۔ درانی ٹرک سے اتر کر سیدھا تھانہ کے اندر چلا گیا۔ رات کی ڈیوٹی پر جو سب انسپکٹر تعینات تھا دروازے ہی پر درانی سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اس وقت گشت پر جا رہا تھا۔ درانی نے اس کو علیحٰدہ لے جا کر حادثہ کی نوعیت بتائی۔ دو سو روپے زبردستی اس کی جیب میں ڈالے اور جب ذرا اطمینان ہو گیا تو اس کو لئے ہوئے ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ چھوٹے بھائی کو ٹیلیفون پر ہدایت کی کہ وہ اسٹیشن ویگن لے کر فوراً تھانہ آ جائے۔

آدھ گھنٹہ کے اندر اندر اسٹیشن ویگن تھانہ پر موجود تھی۔ درانی اور سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ اس میں سوار ہو کر موقعہ واردات کی طرف چل دیئے جب وہ وہاں پہنچے تو سڑک اسی طرح سنسان پڑی تھی۔ وہ آدمی خاک پر بے سُدھ پڑا تھا۔ سب انسپکٹر نے اس کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ ابھی تک وہ زندہ تھا۔ البتہ

بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ زخمی کو اسٹیشن ویگن میں ڈال کر اسپتال پہنچا یا گیا۔

رات کے پچھلے پہر جب ورانی گھر پہنچا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ اسپتال سے اس کو یہ رپورٹ مل ہی چکی تھی کہ زخم مہلک نہیں آئے ہیں البتہ ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ ایکسیڈنٹ سے بے نیاز ہو کر اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کار کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اس کے عوض بیمہ کمپنی سے کس طرح ۵ ہزار کی رقم وصول کی جائے۔ وہ دیر تک بستر پر پڑا اس کے متعلق اسکیم بناتا رہا۔

یہ تو پتہ نہیں کہ پولس کے روزنامچے میں حادثہ کی کیا رپورٹ درج کی گئی البتہ بعض اخبارات میں اس ایکسیڈنٹ کے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس آدمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشا چلایا کرتا تھا۔ حادثہ کی رات وہ مالک کو رکشا واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ نکلسن روڈ کے موڑ پر وہ ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ گیا۔ زخم ایسا کاری لگا تھا کہ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔

عبداللہ ڈیڑھ ماہ تک سرجیکل وارڈ میں پڑا رہا۔ جس روز اس کو اسپتال سے چھٹی ملی تو اس کو وہاں لینے صرف اس کی بیوی آئی تھی۔ کالا کلوٹا عبداللہ جس کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی اور جس کی چودہ سالہ لڑکی ایک دوسرے رکشا والے

سانس فراز ہو گئی تھی۔ اور جواب بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا جسم کبڑوں کی طرح جھک گیا تھا۔

اب وہ تمام دن کوٹھری میں پڑا کھانستا رہتا۔ بات بات پر بیوی سے لڑ پڑتا۔ اس کو بے تحاشا گالیاں دیتا اور مارنے کی دھمکی دیا کرتا۔ اس کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا، داڑھی بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برسا کرتی۔ اس کا چہرہ روز بروز خوف ناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے جو ازراہِ ہم دردی کبھی کبھار اس کے پاس آ کر گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے۔ اب وہ بھی اس سے کترانے لگے تھے۔

عبداللہ جس محلّہ میں رہتا تھا اس کی آبادی زیادہ تر نچلے طبقہ کے افراد پر مشتمل تھی۔ بستی میں ہر طرف جھکی ہوئی چھتوں والے نیم پختہ مکانات تھے چند قدیم وضع کی عمارتیں تھیں۔ جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈر بن گئی تھیں۔ درمیان میں انگریزوں کا پرانا قبرستان تھا جس کے چاروں طرف پختہ چہار دیواری تھی قبرستان میں ایک اونچی سی لاٹ تھی جس پر سنگِ مرمر کا ایک کتبہ آویزاں تھا یہ کسی کرنل کی قبر تھی۔ جس کی تمام زندگی میدانِ جنگ میں غنیم سے لڑتے گزری تھی۔ مگر اس کی موت خودکشی سے واقع ہوئی تھی۔ محلہ بھر میں مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا ہے۔ اکثر سنسان راتوں میں لوگوں نے اس کو گلیوں میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سب سے زیادہ دل چسپ بات یہ

تھی کہ جب کبھی بھی وہ کسی کو نظر آیا تو اس کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا "کھن ٹوش"۔ خدا معلوم اس کی اس طلب کا کیا پس منظر تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس کسی سے بھی اس کی مڈبھیڑ ہوئی اس نے ہمیشہ یہی آواز سنی۔ اور یہ آواز اتنی خوفناک ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کے احاطہ کے ساتھ ساتھ جو پتلی سی گلی جاتی تھی۔ رات گئے راہ گیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اس کے علاوہ محلّہ کی دوسری خصوصیت سکینہ بیگم تھیں۔ جن کے شوہر لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ صرف ایک لڑکا تھا۔ وہ بھی چند سال ہوئے کہ گھر سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے ماں سے ارہر کی کھچڑی کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت کچھ ناساز تھی۔ باورچی نے کچھ توجہ نہ دی۔ دسترخوان پر کھچڑی نہ پا کر صاحب زادے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ بغیر کچھ کھائے پیئے دسترخوان سے اٹھ گئے اس کے بعد اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ البتہ کچھ عرصہ بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ ٹرین کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔ اس بات کے کئی عینی گواہ تھے۔ مگر سکینہ بیگم کسی طرح اس بات کو ماننے پر رضامند نہیں تھیں۔ اگر کوئی ایسی بات کہتا بھی تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتیں۔ ایک سانس میں ہزاروں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا سب نے اس حقیقت کا ان سے اظہار ہی کرنا چھوڑ

دیا تھا۔ بلکہ بعض عورتوں نے ان کو ٹھگنا شروع کر دیا۔ وہ آئے دن کوئی نت نیا قضیہ گڑھ کر لاتیں۔ اور ان سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔ ہر تہوار پر وہ اپنے بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں، خاندان کی ہر خوب صورت لڑکی کے لیے اپنے بیٹے کا پیغام دے دیتیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشاطائیں بلواتیں اور ان کے ذریعہ بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی پوچھتا تو مسکرا کر کہتیں "بس آنے ہی والا ہے۔ ابھی کل ہی تو ایک شخص آیا تھا۔ جس سے اس نے میری خیریت دریافت کروائی ہے۔" کبھی کبھی وہ اس کے خط کا بھی حوالہ دیتیں۔ اور پھر مزے لے لے کر خواہ مخواہ ایک طول طویل قصہ سنا ڈالتیں۔ ہر روز وہ اس کے آنے کا انتظار کرتیں۔ ہر شام ارہر کی کھچڑی تیار ہوتی اور صبح باسی ہو جاتی۔ جس سے محلہ کے کسی مسکین کا پیٹ پل جاتا۔ کئی سال سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔ جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا۔ اس کھچڑی میں سے اس کو بھی حصہ مل جاتا۔ سویرے ہی سویرے اس کی بیوی بارہ دری کی ڈیوڑھی پر پہنچ جاتی اور جب واپس لوٹتی تو دونوں میاں بیوی کے لیے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

عبداللہ کے دن اسی طرح کٹ رہے تھے اتفاق سے اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ طبیعت اچانک کچھ ایسی گڑبڑ ہوئی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئی۔ عبداللہ کو متواتر کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز رات گئے اس نے بیساکھی سنبھالی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ پہر کا

مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی بس شام ہی سے محلہ میں سناٹا پڑ گیا تھا۔ عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے ملحق تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوا تو اس کو میونسپلٹی کی لالٹین کی دھندلی روشنی میں کسی آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ وہیں ٹھہر گیا جب وہ قریب آیا تو عبداللہ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ آدمی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے عبداللہ کے چہرے کی جانب دیکھا اور ایک بارگی اس کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر وہ حلق کے اندر سے نہ جانے کیسی کیسی آوازیں نکالتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ میں دبا ہوا کاغذ کا ایک بنڈل بھی گر پڑا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ لمحہ بھر تک وہ سکتہ کے سے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے بڑھ کر کاغذ کا بنڈل اٹھایا۔ اس کو کھول کر دیکھا۔ گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً ہی گھر پہنچا۔ دونوں میاں بیوی نے مزے لے کر امرتیاں کھائیں اور اللہ میاں کا لاکھ لاکھ شکرانہ ادا کیا۔

دوسرے روز رات کو عبداللہ پھر گلی میں پہنچا اس وقت کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک گلی میں کھڑا رہا۔ مگر کوئی بھولے سے بھی اس طرف سے نہیں گزرا۔ سردی کے مارے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ رہا تھا، تو

اچانک ایک مونگ پھلی بیچنے والا گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ نے اس کے قریب جا کر، بجائے ہاتھ پھیلانے کے ناک میں منمنا کر کہا:۔

"ذرا ٹھہر جانا بھائی!"

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ، بھوتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات۔ اس آدمی پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ کئی لمحہ تک تو وہ آنکھیں پھاڑے چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا اور پھر بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ عبداللہ نے اطمینان سے چادر میں سیر سوا سیر مونگ پھلیاں باندھیں اور چپ چاپ گھر آ گیا۔

ان دو واقعات سے محلہ بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت اب راہ گیروں کو بہت پریشان کرنے لگا ہے۔ پاس پڑوس کے رہنے والوں پر خاصی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ عبداللہ نے اس خوف سے اور بھی فائدہ اٹھایا۔ رات گئے جب راستے سنسان پڑ جاتے تو وہ چپ چاپ گلی کے اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ ادھر کوئی راہ گیر گلی میں داخل ہوا اور وہ اس کی تاک میں لگ گیا۔ قریب آتے ہی وہ بڑی ہیبت ناک آواز میں کہتا "کھن۔ ڈش"۔ اب اس نے باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اور اس کا یہ حربہ کارگر بھی ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی پر اکتفا کر لیتا تھا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ اگر آدمی بے ہوش ہو جاتا تو وہ اس کی جیبیں ٹٹول کر ساری نقدی اپنے قبضہ میں کر لیتا۔

محلہ میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں خوف و ہراس زیادہ پھیل گیا تھا۔ ادھر عبداللہ اپنے کام میں اتنا منجھ گیا تھا اور اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اکثر تو وہ چھپ کر آدمی کو دبوچ بھی لیتا تھا کسی کو صرف قہقہہ لگا کر خوف زدہ کر دیتا۔ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ جیسا موقعہ ہوتا وہ اسی مناسبت سے اپنا نت نیا حربہ استعمال کرتا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ راہ گیروں نے رات کو قبرستان کے پاس والی گلی سے بالکل گزرنا چھوڑ دیا۔ مگر عبداللہ پر اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے گلی سے باہر نکل کر سنسان راتوں کے اندھیرے میں راہ گیروں سے اپنا "ٹیکس" وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی ایک مدّت تک چلتا رہا۔

محلّہ والے کچھ اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ سرِ شام ہی ہر طرف ہُو کا عالم طاری ہو جاتا۔ اور اس ہولناک سناٹے میں عبداللہ اطمینان سے کسی گلی کے نکڑ پر دیوار سے لگا ہوا موجود ہوتا۔ اس کا چہرہ اب اور بھی خوف ناک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی تھی۔ اور آواز میں دم توڑتے ہوئے انسان کی سی کرختگی آ گئی تھی۔ وہ دن بھر کوٹھڑی میں پڑا سویا کرتا اور ایک پہر رات گزرتے ہی کمبل میں اپنے تمام جسم کو لپیٹ کر بیساکھی کے سہارے گھر سے باہر آ جاتا اور رات گئے تک سنسان گلیوں کے اندھیرے میں ٹہلا

کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔

انہی دنوں ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہیں مل سکا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کی بارہ دری میں ایک مدت سے آمدورفت بند کر دی تھی۔ لہٰذا دونوں کو مسلسل کئی وقت کے فاقے کرنے پڑے۔ اس رات عبداللہ بڑی بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں میں منڈلا رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ مگر کوئی بھولا بھٹکا راہ گیر اس کو نہیں ملا۔ اس کی بے چینی اور بڑھ گئی، اس لیے کہ اب رات کی وہ گھڑی قریب آ رہی تھی۔ جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سنائی پڑتی اور جن کی نظروں سے بچنے کے لیے اس کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ آخر جب وہ ناامید ہو گیا تو اس نے ایک نئی تجویز سوچی۔ کئی مکانوں کے دروازوں سے کان لگا کر اس نے اندر کی آہٹ لی اور پھر ایک دروازہ پر جا کر آہستہ سے دستک دی۔ لیکن اس وقت وہ خود بھی خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس لیے کہ اس دفعہ وہ نیا حربہ آزما رہا تھا، جو بے حد خطرناک تھا لیکن وہ کرتا بھی کیا۔ اس وقت اس کے علاوہ اور چارۂ کار بھی نہ تھا۔

اس نے رک رک کر کئی بار دروازے پر دستک دی، ذرا دیر بعد کسی نے اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا "کون؟" عبداللہ نے آہستہ سے کہا "دروازہ کھولو۔"

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ کسی نے اندر سے جھانک کر پوچھا "کون ہے سامنے آؤ۔" عبداللہ اندھیرے سے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آ گیا اور خوف ناک آواز میں بولا۔

"مکھن ڈش۔"

اس آدمی کی ... سٹی گم ہو گئی۔ گلا پھاڑ کر بولا "باپ رے باپ۔"

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھی بھیانک آواز میں کہا۔ "مکھن ڈش۔"

وہ آدمی ایک بارگی چلانے لگا۔ "بھوت، بھوت۔"

اپنے سابقہ تجربہ کے پیش نظر عبداللہ کو اب وہاں سے کھسک جانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب تو یہ خوف زدہ ہو ہی چکا ہے۔ ایک وار اور کروں گا۔ تو سالا بے ہوش ہو کر گر ہی پڑے گا۔ اس نے انتہائی خوف ناک لہجہ میں حلق سے آواز نکالی۔

"ماکھان ڈشش۔"

اس آدمی پر عبداللہ کی اس خوف ناک آواز کا یہ اثر ہوا کہ وہ اور بھی وحشت ناک طریقہ پر چلانے لگا۔ کمرے کے اندر کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے۔ پہلے تو وہ بیدار ہو گئے، ذرا دیر سہمے پڑے رہے پھر سب خوف زدہ ہو کر چیخنے لگے۔

"بھوت۔ بھوت۔"

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سنکر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔ وہ فوراً ہی دروازہ پر سے ہٹ آیا۔ اور کسی نہ کسی طرح قبرستان کے پاس والی تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ اب آس پاس کے مکانوں میں بھی لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کچھ دروازوں سے نکل کر باہر آ گئے تھے۔ کچھ اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ عبداللہ نے دیکھا۔ گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ آگے جانے کے بجائے وہ اندھیرے میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا کئی سیکنڈ تک وہ اسی عالم میں کھڑا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک کوئی تیزی سے آ کر اس سے ٹکرایا اور پھر "بھوت۔ بھوت" کہتا ہوا سرپٹ بھاگا۔

اس کے بعد ایک بارگی بہت سی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اچانک ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آ کر زور سے لگا۔ یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد تو چاروں طرف سے پتھر آ آ کر گلی میں گرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

"گلی میں بھوت ہے۔"

"وہ دیکھو، کچھ نظر تو آ رہا ہے۔"

اس کے بعد "بھوت۔ بھوت" کا نعرہ پھر بلند ہوا اور پتھروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ پتھر برابر آ آ کر اس کے جسم پر لگ رہے تھے اور ایک پتھر تو

اس زور سے اس کے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک دوسرا پتھر اس کی کن پٹی پر لگا اور عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

قریب ہی ایک بدرو تھا۔ عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر وہ اس میں داخل ہو جائے تو وہ اس سنگ باری سے بچ جائے گا۔ یہی طے کر کے وہ گھسٹتا ہوا بدرو کی طرف کھسکنے لگا۔ اچانک ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آ کر گرا اور عبداللہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر ایک بارگی وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

"ہائے مرا"

اس کے بعد عبداللہ کئی بار چیخا، کئی بار اس نے التجا کی۔ لیکن دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا۔ پتھر برابر چلتے رہے۔ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے وہ اس وقت کرنل کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح چلّا رہے اور گلی کے اندر بے تحاشہ پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور بڑا خوف ناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے دن محلہ والوں نے دیکھا۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک بے حد غلیظ آدمی منہ اوندھائے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم کے ہر حصہ پہ کالا کالا خون بہہ کر جم گیا تھا۔ اس کا چہرہ بدرو کے اندر تھا اور کیچڑ میں لت پت۔ یہ عبداللہ تھا جو رات ہی کو مر گیا تھا۔

# ہفتہ کی شام

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گئی۔ پہلے اس نے کمرے کا جائزہ لیا پھر دالان کی طرف دیکھنے لگی۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ باہر اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آخر اس نے مجھ سے پوچھا "بھابی ہیں؟" میں نے جواب دیا:۔
"جی نہیں وہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں گئی ہیں۔ کل واپس آئیں گی۔"
وہ ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ پھر دروازے کی جانب مڑتے ہوئے بولی "اچھی بات ہے۔" لیکن وہ کمرے سے باہر نہ جا سکی دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس دفعہ اس نے میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔
"آج ان کے آنے کا کوئی امکان نہیں؟ ان سے ایک ضروری کام تھا۔"
میں نے کہا۔ "نہیں۔ آج وہ نہیں آ سکیں گی۔"

لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ کہنے لگی۔ "آپ اس وقت میرے لیے پچاس روپے کا بندوبست کر سکیں گے؟" میں تذبذب میں پڑ گیا۔ روپے تو میرے پاس تھے۔ لیکن وہ اپنی ضرورت کے لیے تھے۔ قرض دینے کے لیے نہیں تھے۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہاں ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس کو دیکھ کر ہمدردی یا خدا ترسی کا کوئی جذبہ پیدا ہو سکے۔ وہ صرف خاموشی سے کھڑی میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا۔ میں نے چپ چاپ اٹھ کر سوٹ کیس کھولا۔ پچاس روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے روپے لے کر شکریہ ادا کیا۔ میرے سامنے ہی اس نے انگلی سے انگوٹھی اتاری اور سامنے میز پر ڈال دی۔

"اس کو رکھ لیجئے۔ میں ۱۷ تاریخ کو واپس لے جاؤں گی۔"

اس کی یہ حرکت مجھ کو کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ میں نے کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے۔ روپے جب جی چاہے واپس کر دیجئے گا۔" میں نے انگوٹھی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ لیکن وہ اس کو واپس لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ میں نے جب زیادہ اصرار کیا تو وہ کہنے لگی۔

"اچھا تو پھر یہ روپے رکھ لیجئے۔ میں کہیں اور انتظام کر لوں گی۔"

آخر مجھ کو اس کی بات ماننا پڑی۔ حالانکہ اس کی یہ حرکت مجھ کو کچھ اچھی نہیں لگی۔

وہ جس طرح خاموشی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی طرح باہر چلی گئی میں نے انگوٹھی کو اٹھا کر دیکھا، اچھی خوب صورت وضع کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ لڑکی کا مذاق بڑا ستھرا ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میری اس سے اس طرح بات چیت ہوئی۔ یوں وہ میرے گھر میں اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ میں اس محلہ میں ابھی نووارد ہوں۔ اس لیے پاس پڑوس کے لوگوں کے متعلق میری معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ مجھ کو صرف اتنا معلوم ہے کہ سرکاری کوارٹروں کی دوسری جانب میدان میں مہاجرین کے پھوس اور کچی مٹی کے جو مکانات بنے ہیں انہی مکانوں میں سے کسی میں وہ رہتی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو مرد کہا جائے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے۔ جو مشکل سے دس سال کا ہوگا۔ اس کے علاوہ دو چھوٹی بہنیں اور ماں ہے۔ باپ اور بڑا بھائی فسادات میں مارے گئے تھے۔ ماں اور بہنیں پردہ کرتی ہیں۔ شروع شروع میں جب وہ یہاں آئی تھی تو برقعہ پہن کر باہر نکلتی تھی۔ اب کچھ مدت سے اس کو اتار کر رکھ دیا تھا۔ گھر بھر کا خرچ کیسے چلتا ہے۔ یہ ایک راز ہے کسی کو اس کا علم نہیں۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ لاہور میں لڑکی کا ایک ماموں رہتا ہے۔ جو روپے پیسے سے ان کی مدد کرتا رہتا ہے مگر آج تک کسی ایسے آدمی کو ان کے یہاں نہیں دیکھا گیا۔ یہ باتیں بھی مجھ کو اس طرح معلوم ہوئیں کہ میں جس کوارٹر میں رہتا ہوں۔ وہ ایک سرکاری ملازم کے نام الاٹ

ہے۔ تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس نے یہ کوارٹر مجھ کو ۴۵ روپے ماہانہ کرائے پر دے دیا ہے اور خود جھونپڑی ڈال کے سامنے میدان میں رہتا ہے اگر کبھی اسٹیٹ آفس والے آ کر تحقیقات کریں تو وہ فوراً کوارٹر پہ پہنچ کر اس بات کو ثابت کر دے کہ وہ خود داخل رہتا ہے۔

ذرا دیر بعد میں سگریٹ خریدنے کی غرض سے باہر گیا تو پروڈیشن اسٹور کے پاس، نیاز صاحب مل گئے۔ وہ میرے پڑوس ہی میں رہتے ہیں۔ کسی دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں۔ ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں۔ معاشرہ کی اصلاح کے زبردست حامی ہیں۔ محلہ میں انہوں نے اصلاح المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے۔ ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ اس کے جلسے ہوتے ہیں محلے کے بہت سے رہنے والے اس جماعت کے ممبر ہیں۔ ان ہی کے کوارٹر کے ایک حصہ میں انجمن کا دفتر ہے اور اسی میں ایک چھوٹا سا دارالمطالعہ بھی ہے۔ نیاز صاحب انجمن کے صدر بھی ہیں۔ اس علاقہ میں رہنے والے سب ہی ان کی عزت کرتے ہیں۔ اس روز مجھ پر کچھ زیادہ مہربان تھے۔ بڑے سرپرستانہ انداز میں مشورے دیتے رہے۔ سیاست پر وہ بہت کم بات کرتے ہیں۔ (غالباً سرکاری ملازم ہونے کے باعث) البتہ اخلاقی پستی کا ان کو بہت دکھ ہے اس لیے اخلاقیات کا درس دے رہے تھے۔ اچانک وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

"یہ عورت عائشہ، جو نیم کے پیڑ تلے رہتی ہے۔ اس کی آپ سے کب

سے جان پہچان ہے ؟"

میں نے کہا "جب سے یہاں آیا ہوں، اسی وقت سے گھر میں آنے جانے لگی ہے۔"

کہنے لگے "دیکھئے اس کا اس طرح آپ کے گھر میں آنا جانا مجھ کو قطعی پسند نہیں۔ وہ بے حد خطرناک ہے اور آپ ٹھہرے عزت دار آدمی۔ ایسی عورتوں کو زیادہ منہ لگانا ٹھیک نہیں۔"

اگرچہ عائشہ میں مجھ کو خطرناک ہونے کی اب تک کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ لیکن میں ذرا کمزور طبیعت کا آدمی ہوں۔ لہذا میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ "آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں خود بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتا۔" کہنے لگے۔

"اچھا سمجھنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ فوراً گھر میں تاکید کر دیں اور اس کا آنا جانا بالکل بند کر دیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں سے ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح گھروں کے اندر جا جا کر ٹوہ لگاتی ہے۔ اور پھر چوری کروا دیتی ہے۔ جب سے یہ یہاں آ کر رہنے لگی ہے کئی کوارٹروں میں نقب زنی اور چوری کی وارداتیں ہو چکی ہیں۔"

میں نے چہرے پر زبردستی حیرت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا! تو یہ اتنی خطرناک لڑکی ہے۔ مجھ کو تو کبھی خیال بھی نہ تھا۔"

وہ فوراً بولے "اسی لیے تو میں نے عرض کیا کہ اس کا آنا جانا بند کرا دیجئے
آپ خود غور کیجئے کہ گھر میں کوئی مرد موجود نہیں۔ چار پانچ آدمیوں کا کنبہ ہے
آخر سب کا خرچ کس طرح چلتا ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ خود کس ٹھاٹھ سے رہتی
ہے۔ کوئی دیکھے تو یہی کہے کہ کسی بڑے گھرانے کی عورت ہے؟"

ان کی یہ بات البتہ قابلِ غور تھی کہ عائشہ رہتی بڑی سج دھج سے تھی جدید
وضع کے ترشے ہوئے بال۔ صاف ستھرا سلیقہ سے سلا ہوا لباس، چہرے
پر ہلکا سا میک اپ، خاصی طرحدار لڑکی تھی۔ اس کے سامنے محلہ کے کلرکوں
کی بیویاں، منہ بسورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

نیاز صاحب میرے دروازے تک باتیں کرتے کرتے آ گئے۔ وہ
برابر عائشہ کی برائیاں کرتے رہے۔ اس کو ہر طرح خطرناک ثابت کرنے کی
کوشش کرتے رہے۔ لیکن ایک بات میں نے غور کی وہ یہ کہ وہ اس کا
تذکرہ لڑکی کے بجائے بار بار عورت کہہ کر کرتے تھے (عائشہ کا سن ان
کی بڑی بیٹی سے زیادہ نہ ہوگا)۔

بہرحال عائشہ کا خطرناک ہونا میرے لیے ایک انکشاف ضرور تھا۔
اس کے بعد اس کے متعلق اور بھی بہت سے انکشافات ہوئے۔

مجھ کو جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ کوارٹروں میں رہنے والے عائشہ کے متعلق
بڑی خراب رائے رکھتے ہیں۔ لیکن اس قدر ملامت کرنے کے باوجود ہر شخص

اس کے ذکر میں دل چسپی کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ مگر عائشہ کے بارے میں ہر ایک کی جداگانہ رائے ہے۔ مثلاً یہ کہ فدا احمد جس کا کوارٹر بالکل میری دیوار سے ملحق ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کا ذریعہ بلیک میلنگ ہے۔ اس سلسلہ میں وہ شہر کے ایک لیڈر کا نام لیتا ہے (کم از کم میرے لیے کسی ایسے نام کا اظہار کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں) اس کا کہنا ہے کہ ایک زمانہ میں عائشہ کی ان سے آشنائی تھی۔ پھر آپس میں ان بن ہو گئی۔ لیڈر کچھ اس طرح اس . . . پر فریفتہ تھے۔ کہ انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کو کتنے ہی عاشقانہ خطوط لکھ ڈالے۔ یہ خط ابھی تک عائشہ کے پاس موجود ہیں اب وہ تو کسی اور لڑکی میں دل چسپی لے رہے ہیں۔ لیکن یہ خطوں کی دھمکی دے کر ان سے کچھ نہ کچھ رقم اینٹھ لاتی ہے۔ فدا احمد کے بیان میں کس قدر صداقت ہے اس کو وہی بہتر سمجھ سکتا ہے یا عائشہ جانتی ہے۔ البتہ میں فدا احمد کے متعلق صرف اسی قدر جانتا ہوں کہ وہ ٹائپسٹ ہے۔ معمولی تنخواہ ملتی ہے۔ کنبہ بڑا ہے۔ اس لیے دفتر کے اوقات کے علاوہ کچھ پارٹ ٹائم بزنس بھی کرتا ہے یہ مکانوں کو پگڑی دے کر اٹھانے کا کاروبار ہے۔ اس دلالی سے اس کی اب تک اتنی آمدنی ہو چکی ہے کہ وہ ایک پلاٹ لے کر اس پر مکان بنوانے کے متعلق منصوبہ بنا رہا ہے۔

لیکن صفدر خاں، جو فدا احمد ہی کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ قسمیں کھا کھا

کر کہتا ہے کہ عائشہ الفنسٹن اسٹریٹ کی ایک دکان پر سیلز گرل ہے۔ اس نے خود اس کو دکان پر کام کرتے دیکھا ہے۔ بلکہ ایک آدھ بار اس سے کچھ سامان بھی خرید کر لایا ہے۔ فدا احمد کی بات سے اس کو صرف اختلاف ہی نہیں ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو جھنجلا کر اس کو گالیاں تک دے جاتا ہے۔ وہ عائشہ کی حمایت میں اکثر محلہ والوں سے بھی لڑ چکا ہے۔ بلکہ ایک بار تو اس نے مجھ کو اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ سب لوگ عائشہ سے اس لیے جلتے ہیں کہ وہ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ شروع شروع میں جب وہ یہاں آئی تھی تو ہر شخص اس کے خاندان سے ہمدردی جتا رہا تھا۔ خود نیاز صاحب نے انجمن اصلاح المسلمین اسی غرض سے بنائی تھی پہلے اس کا نام اصلاح مہاجرین تھا۔ جس کے ذریعہ نیاز صاحب نے محلہ بھر سے چندہ جمع کیا۔ دفتر کے لیے اپنا کمرہ دیا۔ عائشہ کو انہوں نے شعبہ خواتین کا سیکرٹری چنا تھا۔ ان دنوں ان کے گھر میں عائشہ کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ پھر نہ جانے کیوں وہ اس سے یک بارگی ناراض ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی مہاجرین کی امداد کی تحریک بھی ختم ہو گئی اور انجمن اصلاحِ مہاجرین کے بجائے ان کے کوارٹر پہ اصلاح المسلمین کا بورڈ نظر آنے لگا۔ پہلے وہ اس کو بے حد سمجھدار اور پاک باز کہتے تھے۔ اب آوارہ اور خطرناک بتاتے ہیں۔ صفدر خاں سب کچھ اس لیے کہتا ہے کہ ایک تو خود اس کی بہن کسی دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔ علاوہ

اس کے دہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جس طرح عائشہ کے لیے سب کو برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ اس کی اطلاع کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح وہ اس کی ہمدردی حاصل کر رہا تھا۔

صفدر خاں کی طرح عائشہ کا ایک اور بھی ہمدرد ہے۔ اس کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ اس کو بہن کی طرح سمجھتا ہے۔ یہ پستہ قد منحنی جسم کا ایک کلرک ہے ــــ انوار۔ عائشہ کے متعلق اس کا بیان سب سے مختلف ہے وہ کہتا ہے کہ عائشہ بے حد نیک اور محنتی ہے۔ بے چاری لاوارث لڑکی ہے جن دنوں وہ یہاں آئی تھی۔ سارا خاندان فاقوں پر فاقے کر رہا تھا۔ آخر اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ اس کو ایک غیر ملکی فرم میں ملازمت دلوا دی۔ اس کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ گھر گھر جا کر یہ تحقیقات کرتی ہے کہ لوگ کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس ایک سوال نامہ ہے جس کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کرتی ہے اس طرح کمپنی یہ جاننا چاہتی ہے کہ پاکستان میں ٹوتھ پیسٹ کی کتنی کھپت ہے تاکہ وہ اس کے مطابق حکومت سے یہ مطالبہ کرے کہ اس کو زیادہ مال امپورٹ کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن انوار صفدر خاں کی طرح عائشہ کے لیے خم ٹھونک کر لڑنے نہیں آتا۔ وہ ایک خاموش کارکن کی طرح اس کی بہبودی کا خواہاں ہے۔ پرسوں کے واقعہ کے بعد میرا خیال ہے کہ انوار بھی اپنی رائے

بدل دے گا۔ وہ ہوا یہ کہ جس بس سے میں دفتر جا رہا تھا۔ اس میں انوار بھی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ صدر کے قریب ایک بس اسٹینڈ پر عائشہ بھی بس میں سوار ہو گئی۔ کنڈیکٹر جب ٹکٹ لینے آیا تو انوار نے عائشہ کا ٹکٹ بھی خرید لیا لیکن ذرا دیر بعد جب کنڈیکٹر دوسری عورتوں سے ٹکٹ کے پیسے لینے لگا تو عائشہ نے بھی پیسے نکال کے دیئے۔ کنڈیکٹر نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا "آپ کا ٹکٹ پیچھے لیا جا چکا ہے" عائشہ نے مڑ کر انوار کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر کنڈیکٹر سے بولی "نہیں میں اپنا ٹکٹ خود لوں گی۔" میں نے دیکھا انوار کا چہرہ اس خفت سے سفید پڑ گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس نے مجھ کو نہیں دیکھا ورنہ وہ اور خفیف ہوتا۔ عائشہ نے جو کچھ اس سلسلے میں کیا وہ درست تھا یا غلط۔ اور انوار نے جو حرکت کی تھی وہ کس جذبے کے تحت تھی۔ یہاں اس سے بحث نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ڈوتھ پلیٹ کی تھپت کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے سلسلہ میں اس نے عائشہ کی جس ملازمت کا ذکر کیا تھا وہ تھی خوب۔ کچھ انوکھی بھی اور حیرت انگیز بھی۔

لیکن اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات جس نے بیان کی وہ شخص خود بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ میں اس کو آرٹسٹ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ لاانکہ وہ اس بات پر مصر ہے کہ اس کو انٹلکچوئل سمجھا جائے۔ حال ان کا یہ ہے کہ سیاست پر بات کریں تو سیاست دان، فلسفہ پر بات کریں تو فلسفی، سائنس

کی بات کریں تو سائنس دان ۔ غرضیکہ وہ اچھا خاصہ تجریدی فن کا نمونہ ہے کہ آپ جس عنوان سے چاہیں اس کو یاد کریں ۔ اس کی شخصیت پہ کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ وہ اپنے پائپ کا کش لگا کر لوگوں کو اس طرح مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جیسے ابھی عقیدت سے ان لوگوں کے سر جھک جائیں گے ۔ لیکن دن بھر فائیلوں سے الجھنے والے دفتری قسم کے لوگ اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتے ۔ وہ اس کو انٹلکچوئل کے بجائے الو کا پٹھہ سمجھتے ہیں ۔ یہی بے چارے کے ساتھ ٹریجڈی ہے ۔ سابقہ اس کا پاکستانیوں سے ہے (جو پس ماندہ قوم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں) اور رکھ رکھاؤ فرانس کے آرٹسٹوں کا سا ہے جہاں زین العابدین کی بھینس (ایک تصویر) کی دم میں نہ صرف برش نہیں بلکہ بتی باندھ کر تصویر کو مکمل کیا جاتا ہے ۔ بہر حال ایک دن مجھ کو آرٹسٹ مل گیا ۔ بڑی اونچی اونچی باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں عائشہ آتی نظر آئی ۔ آرٹسٹ نے مجھ کو روک لیا ۔ کہنے لگا میں اس لڑکی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں ۔ صاحب اس کی چال میں کیا ردھم ہے ۔" مجھ کو اس طرح راستہ میں کھڑے ہو کر دیکھنا بڑا معیوب لگا ۔ پھر مصیبت یہ تھی ۔ کہ ابھی اس نے چال میں ردھم دیکھا تھا ۔ کہیں آرٹسٹک موڈ میں سر تال نہ دینا شروع کر دے ۔ وہ ٹھہری تیز طبیعت کی لڑکی ۔ آرٹسٹ تو سر تال ہی دیتا رہ جاتا ۔ اور وہ ان کو تگنی کا ناچ شروع کرا دیتی ۔ خیریت یہ ہوئی کہ وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھا ۔ جب وہ چلی گئی تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ۔" بڑا پرفکٹ ماڈل

ہے۔ اس ملک میں کسی چیز کی قدر نہیں۔ بھلا غور تو کیجئے کہ کسی آرٹسٹ کا ماڈل اور اس کو تختۂ مشق بنایا جائے کاروباری مقاصد کے لیے۔" یہ بات میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی۔ میں نے پوچھا:۔

"کاروباری مقاصد سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

وہ ہنسنے لگا۔" اوہو، آپ غلط سمجھے۔ میں اس کے چال چلن کے متعلق کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ غالباً آپ کو علم نہیں، یہ لڑکی ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں کام کرتی ہے۔ وہاں اس کو ماڈل بنا کر اشتہار تیار کئے جاتے ہیں یہی جو آپ نے لائف بوائے صابن اور ڈالڈا کے دیکھے ہیں۔ اس بے چاری کو کبھی ماں، کبھی بیوی اور کبھی نوکرانی کے روپ میں پبلسٹی کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے۔" اس کی بات پر میں چونک پڑا۔ یہ ماڈل کی بھی خوب رہی۔

محلّہ میں اسی طرح لوگ قیاس آرائیاں کیا کرتے۔ لیکن عائشہ سب سے بے نیاز، خاموشی سے سب کے سامنے سے گزر جاتی اس آن بان سے کہ سب دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن میں نے غور کیا کہ اس پر لعنت ملامت کرنے والوں میں اور اس کے خلاف اسکنڈل تیار کرنے والوں میں ایوّب سب سے پیش پیش ہے۔ بظاہر وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی معلوم ہوتا ہے بہت اچھا لباس پہنتا ہے۔ بہترین سگریٹ پیتا ہے۔ اور عام طور پر وکٹوریہ اور ٹیکسی میں آتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی محض ایک کلرک ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اس کی

سسرال والے بڑے مال دار آدمی ہیں۔ اس کی بیوی وہیں رہتی ہے۔ اور وہ خود کوارٹر میں تنہا رہتا ہے۔ صفدر خاں جو مکانوں کی دلالی کرتا تھا۔ اس نے کہا بھی کہ کوارٹر کا آدھا ہی حصہ کرایہ پر دے دو۔ مگر وہ قطعی راضی نہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی روز تک اس کے کوارٹر میں تالا پڑا رہتا یا کبھی کبھار اس کا کوئی دوست وہاں آکر ٹھہر جاتا۔ اس کی بیوی ہفتہ میں ایک آدھ بار وہاں ضرور آتی تھی۔ مگر وہ بھی رات بھر کے لیے۔ یوں ایوب اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے جب کبھی مل جاتا تو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ لیکن جہاں عائشہ کا ذکر آیا۔ اور اس نے اس کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔ بات بات پر وہ اس کو آوارہ اور رنڈی کے نام سے یاد کرتا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ تو میں عائشہ کو خطرناک اور نہ آوارہ سمجھ سکا۔ اور نہ اس کے پاک باز اور نجیب الطرفین ہونے پر یقین آیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ مجھ کو بھی کچھ عجیب و غریب سی لڑکی معلوم ہوئی۔ اس روز بھی کچھ ایسا اتفاق ہوا۔ میں گھر میں تنہا تھا کہ وہ آگئی۔ آتے ہی اس نے ۵۰ روپے نکالے اور میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے روپے لے کر تکلفاً ایک آدھ جملہ کہا۔ اور غور سے اس کی جانب دیکھا۔ بظاہر وہ کسی طرح بھی عجیب و غریب نہیں معلوم ہوتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح بات کرنے میں وہ حجاب محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ تنہا ہونے کے خیال سے کچھ گھبرائی ہوئی بھی معلوم ہو رہی

تھی۔ میں بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ لیکن اس نے ایسا موقعہ ہی نہیں دیا۔

"انگوٹھی واپس دیجئے گا؟"

میں چپ چاپ اٹھا اور انگوٹھی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور فوراً لوٹ گئی۔ میں نے غور کیا کہ اس روز ۱۲ تاریخ ہی تھی۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز جب میں دفتر سے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ وہ میری بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ باتیں کچھ گھریلو پریشانیوں اور مہنگائی کے متعلق تھیں۔ میں نے اس سے یوں ہی پوچھ لیا۔

"یہ تو بتایئے کیا آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں؟"

وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ پھر اس نے خفیف ہونے کے انداز میں کہا "دفتر میں کام کرنے کے قابل ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ہمارے ابا نے ہمیں اتنی تعلیم ہی کب دی۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ میں دراصل جو بات پوچھنا چاہتا تھا وہ اب بھی نہ کہہ سکا تھا۔ آخر میں نے اس کا بھی اظہار کر دیا۔ "تو آخر یہ آپ لوگوں کا خرچ کس طرح چلتا ہے؟" اس دفعہ وہ مسکرا دی۔ "آج میرے متعلق آپ اتنی بہت سی باتیں کیوں جاننے کے لئے پریشان ہیں۔ خیریت تو ہے۔" میں کچھ کھسیانہ سا ہو گیا۔

"یوں ہی۔ میرا خیال ہے۔ اس میں کوئی بری بات تو نہیں۔"

وہ بتانے لگی۔ "پہلے ہم لوگ جب یہاں آئے تھے۔ تو ہمارے ایک

ماموں تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ مدد کر دیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔" وہ پھر اداس ہو گئی۔ "آج کل کے زمانہ میں کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ آخر جب بہت برے دن آ گئے تو اماں نے یہ کیا کہ وہ پاس پڑوس سے کچھ کپڑے لے آئیں۔ ہم سب بہنیں مل کر سی ڈالتیں۔ کچھ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔ اب میں نے یہ کیا ہے کہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں جا کر خود سلائی کے آرڈر لے آتی ہوں۔ بہت سی عورتیں درزیوں کو ناپ دیتے ہوئے شرماتی ہیں۔ اس لیے ہم کو اچھا خاصا کام مل جاتا ہے۔ مشینیں خریدنے کے لئے کچھ روپے ہو جائیں تو میں باقاعدہ درزی خانہ کھول دوں گی۔" اس نے بڑی سادگی سے ساری بات کہی تھی۔ جس پہ شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ عائشہ کی آمد و رفت اسی طرح میرے گھر میں جاری رہی۔ لوگوں کی مخالفت کے باوجود میں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ پھر اس کے بعد محلہ میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں۔ فدا احمد کی شادی ہو گئی۔ وہ اب زیادہ تر گھر ہی میں رہتا۔ عائشہ کی حمایت میں لوگوں سے الجھنے کا اس کو موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ آرٹسٹ قسم کا نوجوان انٹلکچوئل سے اچانک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بن گیا۔ نیاز صاحب کے متعلق لوگوں میں چرچے شروع ہو گئے تھے کہ انجمن نے جو فنڈ مہاجرین کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ عرصہ سے اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ملا۔ بلکہ یہاں تک کہا جا رہا تھا کہ اس رقم سے انہوں

نے اپنے منجھلے لڑکے کو جوتوں کی دکان کھلوا دی تھی۔ جس کو اس نے کچھ ریس کورس میں اور کچھ بالاخانوں پر نچھاور کر دیا تھا۔ لیکن یہ ساری باتیں دبی دبی زبان سے کہی جا رہی تھیں۔ پھر ایک روز رات گئے محلہ بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ پولس نے صفدر خاں کے گھر پر چھاپہ مار کر کچھ جواریوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ صفدر خاں پولس کی حراست میں کھڑا اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہا تھا۔ عائشہ کی جانب سے لوگوں کی توجہ ہٹ کر اب ان ہنگاموں پر لگ گئی تھی۔ ہر طرف انہی کا چرچا تھا۔ عائشہ جو پہلے بڑے اہتمام سے نکلتی تھی اب اس میں بھی بڑا فرق آ گیا تھا۔ اب نہ اس کی چال میں وہ آن بان تھی اور نہ چہرے پر وہ آب و تاب۔ جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ دوکانوں پر کھڑے ہوئے لوگ اس کے متعلق جو گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس کو اس کا پورا پورا احساس تھا۔ لیکن اب وہ نکلتی تو کوئی نوٹس نہ لیتا۔ اس کو دیکھ کر مختصر سے بازار میں اس سرے سے اس سرے تک لوگوں میں کوئی کھلبلی نہ مچتی۔ اچانک وہ بالکل غائب ہو گئی۔ لوگوں میں پھر اس کا چرچا شروع ہو گیا کوئی پندرہ بیس روز بعد وہ نظر آئی۔ تو بہت کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے پر زردی تھی اور جسم مرجھایا ہوا سا لگتا تھا۔ اب اس کے گھر میں ایک بچے کے رونے کی آواز بھی سنائی پڑتی تھی۔ ایوب نے جو ہمیشہ اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کہا کرتا تھا۔ اب کی بڑے دعویٰ سے کہا۔ "دیکھئے میں نہ کہتا تھا کہ یہ سالی

ایک نمبر حرافہ ہے۔ اسپتال میں بچہ جننے کے لیے گئی تھی۔ اب تو اس کو گود میں لے کر بھی نکلتی ہے۔" یہ بات اس نے غلط بھی نہیں کہی۔ میں نے خود دیکھا کہ وہ ایک ننھے سے بچے کو گود میں لے کر غالباً ڈاکٹر کے یہاں جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ پھر مجھ کو اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی۔

کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے کہ ایک روز رات کے وقت اس کا چھوٹا بھائی آیا۔ کہنے لگا۔"باجی نے بلایا ہے۔" میں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر دیا۔ ذرا دیر بعد پھر آیا۔ کہنے لگا کہ کھڑے کھڑے ایک بات سن کر چلے جائیے گا۔ بادلِ نخواستہ مجھ کو جانا پڑا۔ اس کے گھر جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ یہ مٹی کی بنی ہوئی دیواروں کا گھروندا تھا۔ پرانے ٹین اور پھوس کی چھت تھی۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ آگے دالان تھا اور اس کے پیچھے ایک کوٹھری تھی۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔"آخر آپ آ گئے۔" میں نے جواب دیا۔

"پہلے یہ بتائیے خیریت تو ہے۔"

وہ کہنے لگی۔"آپ سے ذرا کام تھا۔ بات میں بعد کو کروں گی۔ آپ چائے پی لیجئے۔" رات کے دس بجے چائے پینے کا کوئی موقع و محل نہیں تھا میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ وہ جھٹ سے بول پڑی۔"اچھا یہ بتائیے کہ آپ سگریٹ کون سی پیتے ہیں۔" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اپنے بھائی سے کہنے لگی۔

"دیکھو اماں سے پیسے لے کر سگریٹ لے آؤ۔ کہنا جو سب سے بڑھیا سگریٹ ہو وہی دینا۔" اس نے مڑکر میری طرف دیکھا "قینچی کا سگریٹ اچھا رہے گا نا۔" اور پھر اس نے اسی کو لانے کے لیے کہہ دیا۔ مجھ کو بڑھیا سگریٹ کے اس انتخاب پر کچھ ہنسی سی معلوم ہوئی۔ میں نے منع بھی کیا لیکن اس نے سگریٹ منگوا ہی لی۔ ذرا دیر بعد چائے آ گئی۔ اس کے ساتھ سستے قسم کے بسکٹ بھی تھے۔ میں پیٹ کا یونہی مریض ہوں۔ بسکٹ دیکھ کر روح فنا ہو گئی۔ مگر اس نے اتنا اصرار کیا کہ ان کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ میں چائے پیتا رہا۔ اور برابر سوچتا رہا کہ جاڑوں کی اس سرورات میں یہ "ٹی پارٹی" کس تقریب میں کی جا رہی ہے۔ اسی اثنا میں کوٹھڑی کے اندر سے بچہ کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہنے لگی۔

"اماں اس کو دودھ پلا دیجئے۔ میں نے شیشی میں دودھ گرم کر کے بھر دیا ہے۔"

لیکن بچہ برابر روتا رہا۔ عائشہ کی ماں اس کو چمکارتی رہی۔ پھر بڑبڑانے لگی۔ "خواہ مخواہ کی میرے سر مصیبت ڈال دی ہے۔ کم بخت کسی طرح چپ ہی نہیں ہوتا۔" وہ جھٹ سے بولی۔ "اے ہے، اماں، اتنی سی معصوم جان کو ایسے نہ کہو۔" وہ جل کر کہنے لگی۔

"تو پھر تم خود ہی سنبھالو۔ میرے بس کا روگ نہیں۔"

عائشہ نے جلدی سے جا کر اس کو گود میں اٹھا لیا۔ اور کندھے سے لگا کر دالان میں ٹہلنے لگی۔

میں نے چائے پی کر کہا۔ "اچھا اب بتائیے کہ کیا بات ہے؟"

کہنے لگی: "ابھی بتاتی ہوں۔ ذرا یہ ننھا سو جائے۔"

وہ پھر چپ چاپ ٹہلنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا قلینچی کے "بڑھیا سگریٹ" پیتا رہا۔ اتنے میں اس کے بھائی نے آ کر کہا۔ باجی رکشا نہیں ملی۔ بس اسٹینڈ پر بھی نہیں ہے۔ وہ آہستہ سے بولی: "اچھا اب تم اپنے بستر پہ جا کر لیٹ جاؤ۔"

پھر مجھ سے کہنے لگی: "مجھے کو ایک جگہ جانا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ چل سکیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔" اس نے بڑی عاجزی سے کہا تھا۔ میں بہت سی بدگمانیوں کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ اس نے کوٹھڑی کے اندر جا کر ایک کمبل اوڑھا۔ اور بچہ کو اس کے اندر دبکا کر بولی: "میرے ساتھ آئیے۔" میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

باہر کہر کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ سردی اب اور بڑھ گئی تھی۔ اس وقت گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ محلہ پہ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوارٹروں کے اندر روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ مجھ کو خوف سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ ڈاکٹر کے یہاں جانے کا وقت نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کہاں جا رہی تھی۔ جب تک کوارٹروں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ مجھ سے دور دور چلتی رہی۔ سڑک پہ پہنچ کر وہ

میرے قریب آگئی۔ ہم دونوں گرجا گھر کی جانب جانے والی اندھیری سڑک پر مڑ گئے۔ کچھ دور ہم دونوں یونہی سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے چلتے رہے آخر گرجا گھر کا پھاٹک آ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گئی۔ راستہ بھر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس عرصہ میں پہلی بار اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ "آیئے اندر آ جایئے۔" اور وہ پھاٹک کھول کر احاطہ میں داخل ہو گئی میں۔۔۔ بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔

گرجا گھر تک جانے والے راستہ پر بجری بچھی تھی۔ جو ہمارے قدموں کے نیچے رگڑ کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ کہیں ذرا بھی آہٹ ہوتی تو دل دھڑک اٹھتا کہ ابھی اندھیرے سے نکل کر کوئی سامنے آ جائے گا۔

ہم دونوں اسی طرح سہمے ہوئے چلتے رہے۔ آخر گرجا گھر کے قریب پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ "آپ یہاں درختوں تلے ٹھہر جایئے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے غور کیا کہ اس کی آواز کپ کپا رہی تھی۔

گرجا گھر کے بڑے ہال میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ البتہ سب دروازے بند تھے۔ صرف ایک دروازہ کھلا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہال کے اندر چلی گئی۔ میں بدحواس سا اسی جانب تک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد گرجا گھر کے اندر گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں اور خوف زدہ ہو گیا۔ اسی وقت عائشہ دروازہ سے نکل کر تیزی کے ساتھ میرے پاس آ گئی۔ گھبراہٹ

میں وہ مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آیئے چلیں۔" اور وہ تیز تیز قدم سے چلنے لگی۔ میں بھی اسی رفتار سے چلنے لگا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر میں نے سنا کہ گرجا گھر کے اندر کسی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز گونج رہی تھی۔

جب ہم باہر نکل کر سڑک پر آ گئے تو میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا۔"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "ہاں!" تھوڑی دور تک ہم پھر خاموش چلتے رہے۔ آخر جب گرجا گھر دور ہو گیا تو میں نے پھر دریافت کیا۔

"تم نے اس کو وہاں کیوں چھوڑ دیا؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "اس کے علاوہ اور کرتی بھی کیا؟"

مجھ کو اس بات پر بڑی جھنجھلاہٹ معلوم ہوئی۔ "تم کو اس طرح ننھے سے بچہ کو چھوڑتے ہوئے کچھ دکھ نہیں ہوا؟" وہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھ کو سچ مچ بڑا دکھ ہے۔" اندھیرے کی وجہ سے میں اس کو دیکھ نہیں سکا۔ میرا خیال ہے کہ وہ رو رہی تھی۔ لیکن مجھ کو نہ تو اس پر ترس ہی آیا اور نہ اب جھنجھلاہٹ معلوم ہو رہی تھی۔ آخر میں نے اس سے پھر کہا۔ "آخر تم نے اپنے بچہ کو اس طرح گرجا گھر میں کیوں ڈال دیا؟"

"میرا بچہ؟" اس دفعہ اس کی آواز صاف تھی۔ اور لہجہ میں استعجاب تھا۔

"تمہارا نہیں تو پھر کس کا بچہ تھا؟"

وہ آہستہ سے بولی "اسی لیے تو میں نے اس کو وہاں چھوڑ دیا" لمحہ بھر رک کر اس نے کہا "آپ میری بات کا یقین کریں گے۔ اور اگر آپ یقین نہ بھی کریں تو کیا ہوتا ہے۔ میں کس کس کو یقین دلاتی پھروں گی کہ وہ بچہ نہیں تھا۔ میری ناک میں گوشت بڑھ گیا تھا۔ اس کا اپریشن کرانے کے لیے اسپتال میں داخل ہو گئی تھی۔ وہیں ایک عورت کے بچہ ہوا تھا۔ وہ بہت بیمار تھی۔ آخر بے چاری مر گئی۔ میں نے بڑی کوشش کر کے اس کو لے لیا تھا۔ آپ نے اس کو دیکھا نہیں۔ بڑا خوب صورت بچہ تھا۔ ہائے اب میں اس کو کیسے دیکھ سکوں گی۔ کتنی محنت سے اس کو حاصل کیا تھا اور کس طرح چوروں کی طرح جا کر گرجا گھر کے جھولے میں ڈال کر بھاگی ہوں۔ مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔" میں چپ چاپ سنتا رہا اور وہ بڑے جذباتی انداز میں کہتی رہی "میں نے جب اس کو جھولے میں ڈالا تو وہ اس میں پڑا ہوا کیسا اچھا لگا۔ پھر میں نے گھنٹی بجانے کی زنجیر کو کھینچنے کے لیے پکڑا تو اللہ قسم ایک بار تو جی چاہا کہ زنجیر چھوڑ کر اس کو اٹھا کر بھاگ آؤں۔ مگر پھر وہی مصیبت دھری تھی۔ خدا کرے یہ سب لوگ مر جائیں۔ جنہوں نے اس کو مجھ سے جدا کرا دیا" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کی باتوں میں کتنی سچائی تھی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس وقت مجھ کو اس کی باتوں پر پورا پورا یقین آ گیا تھا۔ راستے بھر وہ سسکیاں بھرتی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ میں نے اس سے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

اس رات مجھ کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ یکایک دروازے پر کسی نے دستک دی میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ یہ منیر تھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "اماں سب خیریت ہی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کچھ سگریٹ تو نہیں ہوں گے۔" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا:-

"اتنی رات گئے تم اپنے گھر سے یہاں سگریٹ ہی مانگنے آئے تھے۔ کچھ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

وہ کہنے لگا "گھر سے کہاں آ رہا ہوں۔ آج تو تمہارے قریب ہی ہوں۔"

میں نے کہا "وہ کیوں؟"

کہنے لگا "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آج کچھ اپنا پروگرام ہے۔ پہلے سگریٹ نکالو میرے پاس ختم ہو گئے ہیں۔ پھر تم کو دکھاؤں گا کہ کیا فرسٹ کلاس لونڈیا ہے۔" وہ اوباش طبع لوگوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ میں نے کمرے کے اندر جا کر سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور لا کر اس کو دے دیا۔ وہ چلتے چلتے کہنے لگا۔ "جی چاہے تو چلے آنا رات کو، کچھ تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا۔ یہیں ۵۳ نمبر کوارٹر میں۔"

میں چونک پڑا۔ یہ تو ایوب کا کوارٹر تھا۔ میں نے اس کو روک کر سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ "اس میں تو ایوب رہتا ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "ہاں وہی رہتا ہے۔ کیوں اس میں تعجب کی کون سی بات؟"

میں نے کہا۔ "بھئی وہ تو بڑا بھلا آدمی ہے۔"

"بھلا آدمی ہے؟" وہ ہنسنے لگا۔ "تم بھی بس یونہی رہے۔ اتنے عرصہ سے یہاں رہتے ہو تم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ سالا کیا کام کرتا ہے۔ نوکری تو وہ صرف اس کوارٹر کے لیے کئے ہوئے ہے۔ پیسے تو زیادہ چارج کرتا ہے مگر ہوٹل سے زیادہ محفوظ جگہ ہے۔"

میں نے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ اگر بیوی نے یہ باتیں سن لیں تو خواہ مخواہ کے لیے بدمزگی پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔

یہ ہفتہ کی شام تھی۔ میں نے سوچا کہ آج سیکنڈ شو سینما دیکھوں گا۔ اسی اثنا میں نیاز صاحب کا پیغام ملا کہ میں ان سے فوراً مل لوں۔ ان کے گھر گیا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ اکٹھا ہیں۔ معلوم ہوا کہ انجمن کا کوئی ہنگامی جلسہ ہے۔ اس دن کچھ زیادہ لوگ موجود تھے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس سے قبل جب مجھ کو صفدر خاں یہاں زبردستی کھینچ کر لایا تھا۔ اس روز بہت تھوڑے لوگ تھے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد جلسہ کی کارروائی شروع ہو گئی۔ بات صرف اتنی تھی کہ کلکٹر کو ایک درخواست بھیجنے کی تجویز تھی جس میں یہ مطالبہ کیا جانے والا

تھا کہ عائشہ ایک آوارہ قسم کی عورت ہے۔ جس سے محلّہ کے نوجوانوں کے اخلاق بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ یہ شریف لوگوں کی بستی ہے۔ یہاں سے ایسی بدمعاش عورت کو فوراً نکالا جائے۔ ایوب نے تقریر کرنے کے سے انداز میں دیر تک اخلاق پر باتیں کیں۔ نیکی اور گناہ پر بحث کی۔ اور آخر میں محلہ کے اندر عائشہ کی موجودگی پر زبردست احتجاج کیا۔ اس کے بعد نیاز نے ایک ٹائپ شدہ درخواست نکالی۔ جو پہلے ہی سے تیار رکھی تھی۔ سب سے اس پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہاں سے کھسک جاؤں یا پھر دستخط کرنے سے انکار کردوں۔ لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں کمزور طبیعت کا آدمی ہوں لہٰذا میں کچھ بھی نہ کر سکا اور چپ چاپ درخواست پر دستخط کر کے چلا آیا۔

سینما پہنچا تو معلوم ہوا کہ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ کچھ دیر تک بازاروں میں ٹہلتا رہا۔ اور جب میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ مہاجرین کی جھونپڑیوں سے عورتوں کے زور زور سے رونے کی آواز آ رہی تھی اور وہاں محلہ بھر جمع تھا میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ سب لوگ عائشہ کے گھر کے سامنے ہجوم کی صورت میں کھڑے تھے۔ اندر اس کی بہنیں رو رہی تھیں۔ بھائی سسکیاں بھر کر ماں کو گھر کے اندر کھینچ کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہ رو رہی تھی نہ چیخ رہی تھی۔ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہی تھی۔

"ذرا ان لڑکیوں کو چل کر سمجھاؤ۔ بھلا میری بچی کہیں مر سکتی ہے؟

ارے مراد خاں! کہیں عائشہ بھی مر سکتی ہے۔ وہ تو فیروز کے لیئے جوتا لے کر ابھی آتی ہوگی"

"آخر تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو۔ مجھ کو اس طرح گھور کیوں رہے ہو۔ ابھی عائشہ کو آنے دو، وہ تم سب کو ڈانٹ کر بھگا دے گی۔ میرے گھٹنوں کے درد کے لیے بازار سے انجکشن لینے گئی ہے۔ ابھی آتی ہوگی۔ بس ابھی" وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی اور لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے کہ بے چاری بڑھیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہجوم کے بیچ میں ایک کانسٹیبل کھڑا تھا جو اسپتال سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ عائشہ ایک تیز رفتار موٹر سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئی۔

اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس کے اندر سے عائشہ کی دیوانی ماں نے ایک ایک چیز نکال کر زمین پر بکھرا دی تھی۔ اس میں جوتے کا ایک ڈبہ تھا۔ انجکشن تھے۔ کچھ کپڑا اور سلائی کا سامان تھا۔ سب لوگ دم بخود تھے سارا محلہ تماشائیوں کی طرح وہاں اکٹھا تھا۔ مجھ سے یہ تماشہ نہیں دیکھا گیا اس لیے میں وہاں سے سیدھا گھر آ گیا۔

○

# چاند کا داغ

کوٹھی کے اندر اچانک اچھی خاصی کھلبلی پڑ گئی۔ سارے ملازم سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کوٹھی کا چپہ چپہ چھان مارا۔ مگر روشنی کا کہیں نشان تک نہ ملا۔ مردان شاہ زخمی شیر کی طرح بپھرا ہوا خواب گاہ کے دروازہ پر کھڑا چیخ رہا تھا۔

"کہاں گئی حرام زادی۔ آج اس کی کھال کھینچ ڈالوں گا۔"

لیکن "حرام زادی" اپنی کھال سمیت ایسی رفوچکر ہوئی کہ مردان شاہ صرف ابابیل کے پَر کی سی گھنی مونچھیں پھڑپھڑاتا رہ گیا۔ بڑی تفتیش کے بعد اتنا معلوم ہو سکا کہ روشنی سرِ شام ہی سے غائب ہے۔ اس کے ساتھ ہی اصطبل کے نئے سائیس داؤد کا بھی کہیں پتہ نہیں تھا۔ مردان شاہ اور بپھر گیا۔ سب دم بخود

تھے ہراساں اور پریشان۔ صرف مردان شاہ کی گرج دار آواز رات کے سناٹے میں دھاڑ رہی تھی۔ اس کی دونوں بیویوں نے اپنے اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند کر لیے تھے اور سہمی ہوئی گم سُم بیٹھی تھیں کہ جانے اب کیا ہونے والا ہے!

آخر نوکروں کی ایک ٹولی کو دوڑایا گیا۔ انہوں نے بستی کے ایک ایک گھر کی "خانہ تلاشی" لے ڈالی۔ جن لوگوں سے داؤد کا میل جول تھا ان پر جوتے بھی پڑے۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر الٹا لٹکایا گیا۔ مرغا بنا کر پتھر کی سل رکھ دی گئی۔ مگر سب بے سود۔ نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ایک مزارع نے صرف اتنا بتایا کہ بستی کے نکڑ پر داؤد نظر آیا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی جس کا جسم چادر میں چھپا ہوا تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ اس لیے وہ اس کو پہچان نہ سکا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے جا رہے تھے۔

اس بات کی اطلاع فوراً مردان شاہ کو پہنچائی گئی۔ اس نے اسی وقت اپنے کام دار کو طلب کیا اور اس کے لیے یہ حکم صادر کیا کہ جس طرح بنے وہ دونوں کو لے کر آئے۔

کام دار بجمبر نے جیپ نکلوائی۔ اپنے ہمراہ پانچ لحیم شحیم جوان لئے اور جیپ پر جا بیٹھا۔ سب کے پاس بندوقیں تھیں۔ اور وہ شکاریوں کی طرح چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔

آناً فاناً جیپ کا انجن گھڑگھڑایا اور وہ ہچکولے کھاتی ہوئی پتھریلی سڑک پر روانہ ہو گئی۔ مردان شاہ دریچہ پر کھڑا جیپ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ ... نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مردان شاہ وہاں دیر تک کھڑا رہا۔ پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا، اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

البتہ کوٹھی کے اندر سب لوگ جاگ رہے تھے۔ ان کو جیپ کے آنے کا انتظار تھا جو بستی سے باہر نکل کر ریت کے ٹیلوں پر ڈگمگاتی ہوئی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ ہر طرف اجلی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ اور ریت کے ذرے جگمگ جگمگ کرتے جھلک رہے تھے۔ اس روشنی میں جیپ کا بے ڈول سایہ اونچے نیچے ٹیلوں پر دوڑ رہا تھا۔

جھیمر نے بستی سے ایک کھوجی کو بھی اپنے ہمراہ جیپ میں بٹھا لیا تھا وہ قدموں کے نشان دیکھ دیکھ کر ڈرائیور کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس طرح انہوں نے دس بارہ میل کا راستہ طے کر لیا۔ دور دور تک کہیں انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ لق و دق صحرا میں صرف ریت کے ٹیلے سر اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی اور ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ!

قدموں کے نشان ریت پر ایک جگہ جا کر ختم ہو گئے۔ وہاں ریت کا ایک بہت اونچا ٹیلہ تھا۔ جیپ کو اس پر چڑھایا تو وہ الٹتے الٹتے بچی اور بالو کے اندر دھنس کر رہ گئی۔ اسی وقت بندوق چلنے کی آواز خاموشی

کے سینے کو چیرتی ہوئی ابھری اور گولی سنسناتی ہوئی جیپ کے پاس سے گزر گئی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسری گولی جیپ کے شیشہ کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔

وہ سب جلدی سے کود کر جیپ کی آڑ میں، ریت پر لیٹ گئے جن کے پاس بندوقیں تھیں۔ انہوں نے آواز کی سیدھ پر نشانہ لے کر بندوقیں چلانا شروع کر دیں۔ نصف گھنٹہ تک دونوں طرف سے گولی چلتی رہی۔ جھمبر جو ایسے معرکے اکثر آزما چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس طرح تو جیپ کے ٹکڑے اڑ جائیں گے اس لیے کہ دوسری طرف کی تمام گولیاں اسی پر آ کر لگ رہی تھیں۔ وہ ریت پر گھسٹتا ہوا ٹیلے کے دوسری جانب چلنے لگا۔ ایک گولی اس کے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دم سادھے لمحہ بھر تک اسی عالم میں پڑا رہا۔ اس نے ایک بار پھر سر ابھارا۔ ٹیلے کے نشیب میں اس کو ایک سایہ لرزتا ہوا نظر آیا اس نے ایک دم اس پر گولی چلا دی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی زور سے چیخا اور دوسری طرف سے گولیاں برسنا بند ہو گئیں۔

جھمبر جس وقت وہاں پہنچا تو داؤد ختم ہو چکا تھا۔ گولی اس کی کنپٹی پر لگی تھی چمکتی ہوئی ریت پر خون کا بڑا سا... دھبہ بن گیا تھا۔ روشنی خوف سے کانپ رہی تھی۔ جھمبر کو شبہ تھا کہ وہاں کئی آدمی ہوں گے۔ لیکن وہاں صرف وہی دونوں تھے۔ داؤد کا ہاتھ ابھی تک بندوق پر تھا۔ اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں روشنی کی

جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ جھیمر نے داؤد کے منہ پر ایک لات جمائی۔ روشنی کا ہاتھ پکڑا اور ریت پر گھسیٹتا ہوا جیپ کی طرف چل دیا۔ داؤد کی لاش وہیں ریت پر پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

تاروں کی چھاؤں میں جیپ بستی کے اندر داخل ہوئی۔ ابھی ڈرائیور نے جیپ کو لاکر کوٹھی کے سامنے کھڑا ہی کیا تھا کہ مردان شاہ کی آنکھ کھل گئی۔ دریچہ پر اس کا خوف ناک چہرہ نظر آیا۔ اس نے گرج کر پوچھا:۔

"لے آئے حرام زادی کو!"

جھمبر نے "حرام زادی" کو جیپ سے دھکیل کر سامنے کھڑا کر دیا۔ مردان شاہ نے ایک بھاری بھرکم گالی دے کر دریافت کیا۔

"اور وہ کہاں ہے نمک حرام؟"

جھیمر اپنی پوری کارگزاری سنانے لگا۔ مردان شاہ نے پوری روداد سنی اور تیزی سے بولا:۔

"تہہ خانے میں لے جاؤ۔"

فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

کئی منٹ بعد جب وہ اس نیم روشن کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کا نسی کا پرانا لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی میں روشنی مادر زاد برہنہ کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ دو آدمی اس کے بازو مضبوطی سے

تھامے کھڑے تھے۔ کمرے کے اندر دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سیلی ہوئی دیواروں سے بڑی تیز بو آ رہی تھی۔ مردان شاہ اس پُر اسرار کمرے کے دروازے پر ٹھہر کر لمحہ بھر تک روشنی کو دیکھتا رہا۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر اس کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں خوف زدہ نظر آ رہی تھیں۔

مردان شاہ نے پوچھا "سب ٹھیک ہے؟"

جھمبر بولا "ہاں سائیں، سب ٹھیک ہے!"

مردان شاہ نے قریب جا کر کہا "لاؤ"۔ فوراً ہی ایک شخص دہکتا ہوا لوہے کا ٹکڑا لیے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس کو مردان شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ مردان شاہ نے اس کا دستہ سنبھال کر سرخ سرخ لوہے کو دیکھا اور روشنی کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے قریب کیا۔ وہ زخمی پرندے کی طرح دونوں آدمیوں کی گرفت میں پھڑپھڑانے لگی۔ مردان شاہ نے لوہے کا گرم گرم حصہ اس کے رخسار پر زور سے جما دیا۔

روشنی بڑی دردناک آواز میں چیخی۔ مردان شاہ نے جب ہاتھ اٹھایا تو اس نے دیکھا۔ روشنی کے داہنے گال پر روپے کے برابر گول سیاہ نشان ابھر آیا تھا۔ وہ چیختے چیختے نڈھال ہو گئی تھی۔

اس نے لوہے کا ٹکڑا دوسرے آدمی کو دے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر

اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کا ایک سرا انگارہ کی طرح دہک رہا تھا۔ روشی اس کو دیکھتے ہی چیخنے لگی۔

اس دفعہ مردان شاہ نے لوہے کا دہکتا ہوا سرا اس کے نرم نرم اجلے سینے کے بیچوں بیچ جما دیا۔ چرچراہٹ کی آواز ابھری۔ اور کھال جلنے کی بُو نیم تاریک کمرے میں پھیل گئی۔ روشی بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ چہرہ سیاہ پڑ گیا اور گال کے ساتھ ساتھ اس کے سینے پر بھی ایک گہرا سرخ نشان ابھر آیا تھا۔

اس کے بعد روشی کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ یہ تیرھویں لڑکی تھی۔ جس کے جسم کو مردان شاہ نے دہکتے لوہے سے داغا تھا۔

دن نکلنے سے پہلے ہی روشی کو کوٹھی سے باہر نکال دیا گیا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ اسی وقت سے مردان شاہ کے لیے دوسری خاص خادمہ کے لیے تلاش شروع ہو گئی۔

شام کو ایک لڑکی پیش کی گئی۔ علی بہر دلال جو لڑکیوں کا بہت بڑا ارتھتی تھا۔ وہ بھی وہاں موجود تھا۔ وہ اس کے پانچ ہزار مانگ رہا تھا۔ مردان شاہ کو لڑکی پسند نہ آئی۔ اس کو لڑکی کے نشانے بڑے بڑے سکڑ ے سکڑائے معلوم ہو رہے تھے۔ یوں ناک نقشہ اس کا اچھا تھا۔ صندلی رنگ تھا اور آنکھیں

جھل مل جھل مل جھلکتی تھیں۔ گھنٹہ بھر بعد کار میں دوسری لڑکی لائی گئی۔ اس کے بیے علی پیر نے، ہزار طلب کئے۔ یہ بھی نامنظور کر دی گئی۔ اس کی گردن ضرورت سے زیادہ لمبی تھی۔

کئی لڑکیاں دیکھنے کے بعد جو لڑکی مردان شاہ کو پسند آئی اس کا مول دس ہزار میں ہوا۔ علی پیر کو اسی وقت پوری قیمت دی گئی۔ اور لڑکی کو کوٹھی کی بوڑھی خادماؤں کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اس کو بنا سنوار کے تیار کر دیں۔

مردان شاہ کو یہ لڑکی بہت پسند آئی۔ وہ بے حد شرمیلی اور خاموش تھی۔ کوٹھی کے دوسرے ملازموں سے اس نے زیادہ میل جول نہ بڑھایا۔ مردان شاہ کی دونوں بیویاں خواہ مخواہ اس سے لڑ جھگڑ پڑتیں۔ اس کے بال پکڑ کر پیٹتیں... مگر اس نے کبھی ان کی شکایت نہیں کی۔ ہر نئی لڑکی کی آمد پر کوٹھی کے اندر جو ہنگامہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ اس دفعہ نہ ہوا۔

اس کا نام تو دو پل تھا۔ مگر مردان شاہ اس کو بلی کہا کرتا تھا۔ مگر اس میں بلی کی کوئی خاصیت نہیں تھی۔ بلی سے زیادہ وہ کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ ہر وقت سہمی سہمی، شرمائی شرمائی، نہ اس نے کبھی یہ بتایا کہ وہ کہاں سے آئی ہے، نہ اپنے گھر بار کا کوئی پتہ نشان دیا۔ پرانی ملازماؤں نے اس کو بہت بہت کریدا مگر وہ ہر بار خاموش ہو جاتی۔ اس کو کوٹھی میں رہتے ہوئے لگ بھگ ایک سال ہو گیا، نہ تو اس کے متعلق کوئی افواہ مشہور ہوئی اور نہ اس نے مردان شاہ

کو کبھی شک و شبہ کا موقعہ دیا۔ وہ ایک سدھے ہوئے جانور کی طرح اس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ لیکن مردان شاہ نہ معلوم کیوں بات بات پر اس سے ناراض ہو جاتا، گالیاں دیتا، مارتا مگر اس نے کبھی بغاوت نہ کی۔ نہ کبھی وہ دوپہر کو مردان شاہ کے بھتیجوں کے کمرے میں دیکھی گئی۔ نہ کبھی رات کے وقت اصطبل کے پاس منڈلاتی نظر آئی۔

مردان شاہ روز بروز اس سے بیزار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں خود بھی اس کی کوئی وجہ نہ آئی۔ ایک روز رات گئے وہ خواب گاہ میں مردان شاہ کے پائنتی کی جانب بیٹھی ہوئی اس کے تلوے سہلا رہی تھی۔ مردان شاہ کو اس روز نیند نہیں آ رہی تھی۔ برابر الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر دو بل کی طرف دیکھا اور اس زور سے اس کے لات ماری کہ وہ نیچے فرش پر گر پڑی۔ مردان شاہ چیخ کر بولا:۔

"باہر نکل جا حرام زادی!"

لیکن وہ اسی طرح فرش پر دم بخود پڑی رہی۔ آخر مردان شاہ خود اس کے پاس آیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ اور کمرے سے باہر دھکیل کر بولا:۔

"یہاں اب آئی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا!"

اس کے بعد وہ بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔ نیند اب اور بھی زیادہ اڑ چکی

تھی۔ وہ رات بھر... پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ ڈو بل پھر واپس نہ آئی۔ حالانکہ اس کو یقین تھا کہ وہ آئے گی ضرور۔ مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ اس بات پر اس کو اور بھی غصہ آیا۔ رات کے پچھلے پہر وہ کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ کوٹھی میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ مگر وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ پھر وہ ٹہلتا ہوا اس طرف چل دیا۔ جہاں کوٹھی کے ملازم رہتے تھے۔ ایک دیوار کے پاس اس کو اندھیرے میں کسی کا سایہ نظر آیا۔ مگر جب وہ وہاں پہنچا تو کوئی تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ البتہ ڈو بل وہاں کھڑی تھی۔

مردان شاہ نے اپنے چوڑے چوڑے ہاتھوں میں اس کی گردن دبوچی اور اس کو دھکیلتا ہوا اس کمرے میں لے گیا جس کی دیواریں سیلی ہو تھیں۔ اور جہاں تیز بو رچی ہوئی تھی۔ اس نے کانسی کا وہ بھدا سا لیمپ روشن کیا۔ جس کو اس کمرے کے بجائے میوزیم میں ہونا چاہیئے تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ ڈو بل کے سارے کپڑے اتارے۔ اور لیمپ کی روشنی میں لوہے کا خم دار ٹکڑا گرم کرنے لگا۔ وہ چپ چاپ کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی جب لوہا دہکنے لگا تو مردان شاہ نے اس کے بال پکڑ کر چہرہ کو سامنے کیا اس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ البتہ جب اس نے ڈو بل کے رخسار پر دہکتا ہوا لوہا لگایا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ دوسری بار جب

اس نے دو بل کے سینہ کو داغا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

سویرا ہونے سے پہلے جب وہ دو بل کو کوٹھی سے باہر نکال رہا تھا تو اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "سائیں میں اب کہاں جاؤں؟" مگر مردان شاہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ کوٹھی کے پھاٹک سے اس کو باہر دھکیل کر اس نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ تیز تیز قدم چلتا ہوا اپنے کمرہ میں آ گیا۔

اس روز وہ دن چڑھے تک پڑا سوتا رہا۔ لیکن آنکھ کھلتے ہی اس کو دو بل یاد آ گئی۔ وہ شرمیلی لڑکی جس کو وہ پیار سے بلّی کہتا تھا۔ مگر وہ بستی سے نہ معلوم کہاں جا چکی تھی؟ مردان شاہ تمام دن اداس رہا۔ وہ بار بار پچھتا رہا تھا کہ اس نے برا برا کیا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جس کے جسم کو داغ کر اس نے دکھ محسوس کیا تھا۔

اب وہ اکثر راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں رات کے سناٹے میں بیٹھا چاند کو تکا کرتا۔ کوٹھی میں دو بل کی جگہ ایک اور لڑکی آ گئی تھی۔ وہ بڑی طرح دار لڑکی تھی مگر مردان شاہ کو اس سے زیادہ رغبت پیدا نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں وہ بیمار پڑ گیا۔ شہر سے بڑے بڑے ڈاکٹر روزانہ صبح شام آتے مگر مردان شاہ کی طبیعت گرتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم زردی مائل ہو گیا تھا۔ چیتے کی طرح تیز چمکتی ہوئی آنکھیں بے رونق ہو گئی تھیں۔ بظاہر اس کو کوئی

عارضہ نہیں تھا۔بس کبھی کبھی اس کو دورہ پڑتا تھا۔اس وقت اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، منہ سے کف جاری ہو جاتا، آنکھوں میں خون اتر آتا اور گھنی مونچھیں ابابیل کے پروں کی طرح پھڑپھڑانے لگتیں۔

جنون کا یہ دورہ اس وقت پڑتا تھا جب اس کو کوئی خوب صورت عورت نظر آتی تھی۔اس کا جی چاہتا کہ اس کا چہرہ داغ دے۔پھر دردناک چیخیں ابھرنے لگیں اور گوشت کے جھلسنے کی تیز تیز بو ہر طرف پھیل جائے اس وقت اس کو وہ لڑکیاں یاد آجاتیں۔جن کے جسموں کو اس نے دہکتے لوہے سے داغا تھا۔ان میں وہ دبلی بھی شامل تھی۔وہ شرمیلی لڑکی جو ہر وقت خوف زدہ نظر آتی تھی اور جو قریب کی بستی میں ایک کھنڈر کی دیوار تلے پڑی سسک رہی تھی۔اس کا جسم سڑنے لگا تھا۔اور چہرے کو دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔بہت عرصہ بعد ایک ڈاکٹر کو مردان شاہ کی اس دیوانگی کا پتہ چلا۔تو اس نے ایک ماہر نفسیات سے علاج کرانے کا مشورہ دیا۔

دوسرے ہی دن اس ماہر نفسیات کو مردان شاہ کی کوٹھی پر لایا گیا وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔اپنی وضع قطع سے وہ خود نیم پاگل معلوم ہوتا تھا۔ پہلے روز اس نے مردان شاہ سے کوئی بات نہیں کی۔صرف اس کی حرکات وسکنات کا مطالعہ کرتا رہا۔دوسرے دن وہ مردان شاہ سے

اس نوعیت کے سوالات پوچھ رہا تھا جیسے عدالت میں وکیل، ملزم سے جرح کرتے ہیں۔ مردان شاہ کو ان سوالوں سے بڑی الجھن ہوتی۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کر اس کے پاس سے چلا جاتا، اپنے بال نوچ ڈالتا، یا صرف بے بس ہو کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اور دیر تک اسی عالم میں پڑا رہتا۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک دن باتیں کرتے کرتے ماہرِ نفسیات کو نہ جانے کون سا سراغ مل گیا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ چٹکی بجا کر بولا:۔

"اب آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کا مرض سمجھئے کہ اب چلا ہی گیا۔ بس چند دنوں کی بات ہے!" اس بات سے مردان شاہ کو بھی قدرے اطمینان ہوا اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن علاج پھر بھی نہ شروع ہو سکا۔ ماہرِ نفسیات کو نئے چاند کے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔ آخر جب دوسرے مہینے چاند نکلا تو کوٹھی کی چھت پر سرِ شام ہی ایک بڑا سا ٹب رکھوا دیا گیا۔ اس میں صاف ستھرا پانی بھرا تھا۔ ٹب کے پاس ہی دو آرام کرسیاں ڈال دی گئیں۔ ایک پر مردان شاہ کو بٹھایا گیا اور دوسرے پر خود ماہرِ نفسیات بیٹھا۔ مردان شاہ اس کی ہدایت کے مطابق ٹکٹکی باندھے ٹب کے اندر چاند کے عکس کو تکنے لگا۔

کئی دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ شروع شروع میں تو مردان شاہ کو تھوڑی دیر بعد فرصت مل جاتی۔ اس لیے کہ چاند غروب ہوتے ہی دونوں اٹھ جاتے لیکن جب

چاندنی راتیں طویل ہوگئیں تو یہ شب بیداری مردان شاہ کو بہت شاق گزری۔ اب چاند کا دائرہ روز بروز مکمل ہوتا جا رہا تھا۔ مردان شاہ چاند کو تکتے تکتے اونگھنے لگتا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ جاتا۔ اور وہ بے چینی سے آرام کرسی پہ کروٹیں بدلنے لگتا۔ اسی وقت ماہر نفسیات پانی کی سطح پر ایک کنکری پھینکتا۔ ٹب کے اندر بھرے ہوئے پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا۔ اور چاند کا جھلکتا ہوا گول مٹول چہرہ شیشہ کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا۔ مردان شاہ پر اس کا فوری ردِ عمل یہ ہوتا کہ اس کی رگ رگ میں ایک نئی حرارت، ایک نئی توانائی آ جاتی اور اس کی آنکھیں ایک نامعلوم مسرت سے چمک اٹھتیں۔

ماہر نفسیات خاموش بیٹھا اس کی ہر ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہتا۔ رات بھر میں وہ بارہا ٹب میں کنکریاں پھینک کر چاند کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہتا۔ ابتدا میں تو اس کی حرکت سے مردان شاہ کو بڑا لطف آتا۔ لیکن چند روز بعد اس کا ردِ عمل بالکل مختلف ہوا۔

یہ چاند کی اترتی تاریخیں تھیں۔ راتیں بڑی سہانی ہوتیں۔ صحرا کی ہلکی خنک ہوائیں چلتیں اور ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوتی۔ ایک ایسی ہی خوبصورت رات کا ذکر ہے کہ ماہر نفسیات نے پانی کی سطح پر کنکری پھینکی تو اس کی یہ حرکت مردان شاہ کو بڑی ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کی بھویں تن گئیں اور وہ اس کو گھور کر دیکھنے لگا۔ مگر زبان سے اس نے ایک لفظ نہ کہا۔ دوبارہ جب

اس نے یہی حرکت کی تو وہ اور بھی بے چین ہوا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پانی میں کنکری گرنے کے ساتھ ہی مردان شاہ تکلیف سے آنکھیں بند کر لیتا۔ اس روز وہ رات بھر اس تکلیف سے دوچار ہوتا رہا۔ دوسرے روز اس کی یہ تکلیف اور بڑھ گئی۔ پھر تو اس کا یہ عالم ہو گیا کہ ادھر ماہر نفسیات نے کنکری پھینکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور وہ جھٹ سے اس کا ہاتھ تھام لیتا کبھی خوشامد کرتا، کبھی غصہ سے بگڑ اٹھتا۔ کبھی وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا۔

یہ سلسلہ بھی کئی دن چلتا رہا۔ اب چاند ڈھلنے لگا تھا اور مردان شاہ رفتہ رفتہ ہر عمل کا عادی بنتا جا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ تماشا ایک عام سی بات بن گئی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا ہوتا۔ نہ آنکھوں کا انداز تبدیل ہوتا۔ جب یہ منزل آ گئی تو ایک روز ماہر نفسیات نے اعلان کر دیا کہ وہ اب بالکل صحت مند ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اب اس کا جسم پہلے کی طرح فربہ ہو گیا تھا اور چہرے پر تازگی آ گئی تھی۔

جب مردان شاہ کے صحت یاب ہونے کا مژدہ سنایا گیا تو کوٹھی میں ایک نئی ہل چل پیدا ہو گئی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اس کو مبارک باد دیتے رہے دو اونٹ ذبح کر کے ان کا گوشت بستی بھر میں تقسیم کیا گیا۔ مسجد کے ملّا کو نیا جوڑا دیا گیا۔ مردان شاہ نے اس روز لباس میں خاص اہتمام کیا تھا۔

رات ہونے سے کچھ دیر پہلے ماہرِ نفسیات کو ۲۹۲ روپے کے بل کے علاوہ مردان شاہ نے ایک ہزار روپے . . . . بطور انعام دیا۔ اور اپنی نئی کڈلک میں بٹھا کر شہر بھجوا دیا۔

اس روز علی پیر نے مردان شاہ کے لیے ایک خوب صورت لڑکی بھی بھجوائی تھی۔ مردان شاہ نے اس کو بہت پسند کیا۔ اس رات وہ جلد ہی سونے چلا گیا۔ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ کھلی تو لڑکی کمرے سے غائب تھی مردان شاہ کو ایک دم غصّہ آ گیا۔ وہ بپھرا ہوا کمرے سے باہر نکلا او دیوانوں کی طرح کوٹھی میں اس کو تلاش کرنے لگا۔ مگر اس کا وہاں پتہ نہ تھا۔ اس خبر سے کوٹھی کے اندر ایک بار پھر کھلبلی پڑ گئی۔ ہر شخص خوف زدہ نظر آنے لگا۔

گھنٹہ بھر بعد جھمبر اس لڑکی کو بستی کے ایک مکان سے ڈھونڈ کر لایا اس کو دیکھتے ہی مردان شاہ کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح خون اتر آیا۔ اسی وقت اس کو سیلی ہوئی دیواروں والے کمرے میں بھیجا گیا۔ وہاں مردان شاہ نے اس کے گلابی جسم کو لوہے سے داغا اور سویرا ہونے سے پہلے ہی دھکّے دے کر کوٹھی سے نکال دیا۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اس کا غصّہ کم نہ ہوا۔ اس نے ماہرِ نفسیات کو ہزاروں گالیاں دیں۔ ایک ملازم کی کمر پر خواہ مخواہ ٹھوکریں ماریں اور کمرے کے اندر رکھے ہوئے شیشہ کے تمام گلاس فرش پر پھینک پھینک کر چکنا چور کر دیئے ؂

دوسرے دن وہ تھکا ہُوا سا اپنے کمرے کے اندر پڑا رہا۔ نہ کوٹھی سے نکل کر باہر مہمان خانے میں گیا، نہ کسی سے بات چیت کی۔ چپ چاپ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ لیکن شام کو ایک نئی مصیبت نازل ہوئی۔ اندھیرا پھیلتے ہی اس کے مزارعوں نے کوٹھی کو گھیر لیا۔ وہ اونچی آواز میں چیخ رہے تھے۔ شور سنکر وہ دریچہ پہ گیا تو اس نے دیکھا کوٹھی کے باہر بستی کے تمام لوگ ..... ہجوم بنائے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ مردان شاہ ان کو دیکھ کر غصہ سے چیخنے لگا۔

"جاؤ بھاگو یہاں سے، ورنہ ایک ایک کی کھال کھنچوا دوں گا۔"

مگر وہ اسی طرح وہاں جمے رہے۔ بلکہ انہوں نے اب اور زور زور سے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں چیخ رہے تھے۔

"ہم یہاں سے نہیں جائیں گے!"

"تم نے اس لڑکی کا بدن کیوں جلا دیا؟"

"شاہ جی! دوسروں کی بہو بیٹیوں کی عزت خراب کرتا ہے!"

"آخر یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟"

"ہاں جی! یہ ایسی بات کیوں کرتا ہے؟"

مردان شاہ نے دیکھا کہ وہ کسی طرح جانے کا نام نہیں لیتے تو اس نے جمبر کو بلایا اور اس کو کچھ ضروری ہدایتیں دے کر بھیج دیا۔ ذرا دیر بعد کوٹھی

کے ایک حصہ سے بندوق چلنے کی آواز ابھری۔ ہجوم میں کھل بلی پڑ گئی کچھ سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ بعض دیواروں کی آڑ میں چھپنے لگے۔ دوسری بار گولی چلی تو کوٹھی کے سامنے سے ہجوم چھٹ چکا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ پھر شور کرتے وہاں اکٹھا ہو گئے۔ کوٹھی سے پھر گولیاں برسنے لگیں۔ لیکن اس دفعہ دوسری طرف سے پتھر آ آ کر کوٹھی کی کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرانے لگے۔ ایک پتھر مردان شاہ کے شانے سے چھلتا ہوا گزر گیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ باہر ملی جلی آوازوں کا شور گرج رہا تھا۔ گولیاں چیخ رہی تھیں اور پتھر ادھر ادھر آ آ کر کوٹھی کی دیواروں پر گر رہے تھے۔ پھر اچانک اس نے کوٹھی کے اندر شور محسوس کیا۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ اسی وقت کئی آدمی کمرے کے اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک قوی ہیکل نوجوان نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اور اس کو اٹھا کر کوئلہ کی بوری کی طرح پختہ فرش پر ٹپک دیا۔ پھر اس نے لاتوں اور گھونسوں سے اس کی مرمت شروع کر دی کسی نے اس کے منہ پر اس زور سے جوتے کی ٹھوکر ماری کہ کھال کٹ گئی اور اس میں سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے گرد ملازموں

کے علاوہ پولیس کے آدمی بیٹھے تھے۔ کوٹھی میں ہر طرف ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سناٹا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے بتایا کہ سارے بدمعاشوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مردان شاہ کے چہرے پر ایسی کاری ضرب لگی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس کو اسی وقت موٹر میں ڈال کر اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کے زخم پر پانچ ٹانکے لگائے گئے۔

ہفتہ بھر بعد جب وہ اسپتال سے نکلا تو اس کا زخم مندمل ہو چکا تھا البتہ چہرے پر اس کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ یہ ہلال کی طرح نصف دائرہ میں بنا ہوا ایک سیاہ دھبہ تھا۔ غالباً جوتے کی ایڑی میں لوہے کی نعل جڑی ہوئی تھی۔ جو اس کے چہرہ پر اپنی پوری چھاپ چھوڑ گئی تھی۔

اس حادثہ کو اب تین سال ہو چکے ہیں۔ کوٹھی پر حملہ کرنے والوں میں سے اکثر ابھی تک جیل میں پڑے ہیں۔ بستی کے لوگ مردان شاہ سے اب بھی خائف رہنے لگے ہیں مگر اس عرصہ میں مردان شاہ نے کسی لڑکی کے جسم کو کبھی دہکتے ہوئے لوہے سے نہیں داغا۔ حالانکہ کوٹھی میں اب بھی دو چار مہینے بعد ایک نئی لڑکی آجاتی ہے۔ مردان شاہ کا عجیب و غریب مرض ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رفع ہو چکا ہے لیکن اس کو کبھی کبھی یہ فکر ستاتی

رہتی ہے کہ اس کے چہرہ پر سے یہ بدنما داغ مٹ جائے تو بہت اچھا ہے ⁂

○

# خان بہادر

لائبریری تک پہنچنے کے لیے ایک کشادہ گیلری سے گزرنا پڑتا تھا۔ جس کی گہری نیلی دیواروں پر قدیم فنِ مصوری کے اعلیٰ شاہکار آویزاں تھے بلور کی دیوارگیریاں اور چاندی کے منقش شمع دان تھے۔ رات گئے جب موم بتیاں روشن ہوتیں تو ان کی کافوری روشنی میں گیلری کے در و دیوار پر ایک مقدّس سناٹا چھا جاتا۔ کارنس پر رکھے ہوئے کلاسی کے مجسمے زیادہ باوقار نظر آتے اور آبنوسی الماریوں میں قرینے سے سجے ہوئے تاریخی نوادرات کی عظمت اور بڑھ جاتی۔

سہ پہر کے سائے طویل ہو گئے تھے اور گیلری پر ایک ہیبت ناک سکوت چھایا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر گیلری کے اندر سب سے پہلے وانفورڈ

داخل ہوا اس کے پیچھے خان بہادر عبد الباقی تھا۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر خان بہادر کا نوجوان پرائیویٹ سیکرٹری مؤدب کھڑا تھا۔ تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گیلری کے اندر آ گئے۔ والفورڈ گہری نظروں سے گیلری کے نوادرات کا معائنہ کر رہا تھا۔ نوادرات میں اس کی دل چسپی دیکھ کر خان بہادر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ وہ بڑی مستعدی کے ساتھ ان تاریخی اشیا کے متعلق ایک ایک تفصیل بتا رہا تھا۔ بار بار وہ ہاتھوں کو مل کر اظہارِ معذرت کے طور پر کہتا۔

"اگر آپ سے ہندوستان میں ملاقات ہوتی تو پھر میں آپ کو اپنے نوادرات کا ذخیرہ دکھاتا۔ یہ تو سمجھئے بچی کھچی اشیا ہیں۔ کچھ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ کچھ ادھر ادھر سے خرید کر اکٹھا کی ہیں۔ یہ بھی سمجھئے کہ غنیمت ہے ایک شرنارتھی ہندو سے جائیداد کا تبادلہ کر لیا تھا تو اتنا بھی ٹھکانہ ہو گیا ورنہ الاٹمنٹ کے چکر میں سرکاری دفتروں کا طواف کرتے کرتے ٹانگیں ٹوٹ گئی ہوتیں۔"

والفورڈ بڑی دل چسپی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ درمیان میں کبھی کبھی وہ کوئی مختصر سا سوال بھی کر لیا کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر طرح خان بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ چلتے چلتے والفورڈ ایک الماری کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس کے اندر ایک لمبی سی تلوار لٹکی

ہوئی تھی۔ اس کا دستہ سونے کا تھا۔ اور کہیں کہیں سیاہ دھبے تھے۔ جن کو کسی خاص وجہ سے صاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"خان بہادر۔ اس تلوار کے اوپر یہ دھبے کیسے ہیں؟"

خان بہادر نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط کے ساتھ الماری کا ایک پٹ کھولا۔ اور مسکرا کر بتانے لگا۔ "جی یہ خون کے دھبے ہیں۔ اس تلوار سے میرے دادا نے ۱۸۵۷ء میں ۱۲۰۰ باغیوں کو قتل کیا تھا۔" والفورڈ کو اس کی بات پر جیسے یقین نہ آیا۔ آنکھیں پھاڑ کر بولا:۔

"۱۲۰۰ باغیوں کو قتل کیا تھا۔ کیسے؟"

خان بہادر سینہ چوڑا کر کے بڑے مفتخر لہجے میں کہنے لگا۔ "بظاہر آپ کو یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہو گی۔ مگر ہے یہ اپنی جگہ حقیقت۔ دراصل میرے دادا مرحوم نواب عبداللہ غضب کے جری اور بہادر تھے۔ ان کے لئے تو مشہور ہے کہ شیر کا شکار ہمیشہ تلوار سے کیا۔ میدان جنگ میں دشمن کو ہمیشہ للکار کر مارتے تھے۔ کبھی غافل دیکھ کر حملہ نہیں کیا۔" والفورڈ خان بہادر کی بات کی تردید کرنا نہیں چاہتا تھا کہنے لگا۔

"میں نے غدر پر ایک کتاب دیکھی تھی۔ غالباً اس میں ان کا بھی تذکرہ ہے۔ عرصہ کی بات ہے، ورنہ میں آپ کو اس کتاب کا نام بھی بتا دیتا۔"

اُن کے اس جھوٹ پر خان بہادر کے نوجوان سیکرٹری نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔ مگر خان بہادر کا سینہ اور بھی کشادہ ہو گیا۔ بڑے طمطراق سے بولا" ضرور پڑھا ہو گا۔ ان کا تذکرہ آپ نے یہ تو غدر کا بڑا مشہور واقعہ ہے۔ جس وقت ہندوستانی فوج میں بغاوت پھیلی، میرے دادا قلعہ چاند گڑھ کے قلعہ دار تھے۔ باغی جب میرٹھ سے نکل کر دہلی کی جانب بڑھے تو گرد و نواح کے علاقوں کے انگریزوں نے قلعہ چاند گڑھ میں آکر پناہ لی تھی ان کی تعداد سینکڑوں تھی۔ لیکن جب باغیوں کا ایک دستہ چاند گڑھ کی طرف بڑھا تو انگریز حکام کو بڑی تشویش ہوئی، دادا مرحوم نے ان سے کہلوا دیا کہ جب تک ان کی گردن پر سر ہے۔ کسی پر ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔ انہوں نے وہی کیا۔ جب باغیوں کی فوج قریب آگئی تو انہوں نے کہلوا دیا کہ اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سمجھنا کہ منہ کی کھانی پڑے گی۔ مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر میرے دادا نے خود قلعہ سے نکل کر حملہ کیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ایک ایک کو چن چن کے قتل کر دیا۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں یہی تلوار تھی۔ انہوں نے بارہ سو کے بارہ سو باغی تہ تیغ کر دیئے"

(اس میں شک نہیں کہ قلعہ دار عبداللہ نے سونے کے دستے والی تلوار سے ۱۲۰۰ باغیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ لیکن روایت کچھ اس طرح ہے کہ عبداللہ نے باغی فوج کو دھوکے سے قلعہ کے باہر دلاسا دے کر ٹھہرا لیا تھا

اور کھانے میں زہر مِلوا دیا۔ جب وہ زہر سے ہلاک ہو گئے تو اپنی بہادری کا سکہ بٹھانے کے لئے ان کو رات کے اندھیرے میں قتل کر دیا۔)

والفورڈ بڑی توجہ کے ساتھ خان بہادر کی باتیں سُن رہا تھا جو اس تلوار کے متعلق ایک ایک تفصیل بتا رہا تھا — "آخر جب امن و امان قائم ہوا تو میرے دادا کو بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی۔ اس وقت سے یہ تلوار ہمارے خاندان میں ایک قیمتی ورثہ کے طور پر بڑی عزت سے دیکھی جاتی ہے۔" والفورڈ اس کی باتوں سے واقعی متاثر ہو گیا تھا یا محض خان بہادر کو خوش کرنے کے لیے اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ تلوار کے سامنے سر جھکا دیا۔

اس کے بعد اس نے وہ درجنوں طلائی اور نقرئی تمغے دکھائے، جو اس کے بزرگوں کو حکومتِ انگلستان کی خیر خواہی میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے . . . صلہ میں عطا ہوئے تھے۔ وہ اسی قسم کے خاندانی نوادرات دکھاتا ہوا جب ایک الماری کے پاس پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ مخمل کے ایک کارچوبی غلاف پر پرانی وضع کا ایک گھسا گھسایا جوتا رکھا ہوا تھا۔ والفورڈ اس کو دیکھ کر بہت چکرایا۔ اس کی سمجھ میں اس جوتے کی وہاں موجودگی کا کوئی سبب نظر نہ آیا۔ پھر وہ گھسا گھسایا جوتا جس اہتمام سے سجا کر رکھا گیا تھا وہ اور بھی تعجب انگیز امر تھا۔ کہنے لگا۔

"خان بہادر یہ جوتا ہی ہے یا کچھ اور؟"

خان بہادر مسکین سی صورت بنا کر بولا" ہے تو یہ جوتا ہی مگر یہ بہت بڑی خاندانی امانت ہے۔ اس کے ساتھ ہمارے خاندان کی عظمت وابستہ ہے کیوں نہ میں آپ کو بھی اس کی تاریخی اہمیت سے آگاہ کر دوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے دادا بڑے عیاش جاگیردار تھے۔ انہوں نے اپنی عیاشی میں ساری جائیداد بالکل تباہ کر دی تھی۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ ان کے انتقال کے بعد میرے والد پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تمام جاگیر نیلام ہو چکی تھی۔ ان کی حالت اس بھری دنیا میں ایک قلاش کی سی تھی پھر اسی جوتے نے دستگیری کی اور آج اسی کے طفیل آپ یہ جائیداد اور ٹھاٹھ باٹ دیکھ رہے ہیں۔"

والفورڈ اور بھی چکرایا کہ بھلا یہ سوکھا سڑا جوتا کس طرح دست گیری کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی حیرت کا اظہار نہ کر سکا۔ خود خان بہادر ہی نے اس کی الجھن کو بھانپ لیا۔ کہنے لگا۔

"جب والد مرحوم بہت پریشان ہو گئے تو انہوں نے اپنے بزرگوں کے تمغات اور انگریز افسروں کے سرٹیفکیٹ لے کر حکام کے پاس درخواستیں گزارنا شروع کیں۔ انہی دنوں خوش نصیبی سے ایک نیا کمشنر تبدیل ہو کر آیا تھا۔ اس کا تعلق کچھ شاہی خاندان سے تھا۔ اس لیے اس کو بڑے اختیار حاصل تھے والد مرحوم نے اس سے ملنے کی بہتیری کوشش کی مگر رسائی

نہ ہوئی۔ آخر انہوں نے اس کے ایک منہ چڑھے خانساماں سے یارانا گانٹھا اور ایک روز رات کو اس کے بنگلہ پر جا پہنچے وہ اس وقت باہر لان میں بیٹھا شراب سے شغل کر رہا تھا۔ وہ اس کے روبرو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے پوچھا۔ کیا چاہتے ہو؟ مگر ان سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ خاموش کھڑے رہے اس نے اصرار کر کے پوچھا مگر ان کا منہ پھر بھی نہیں کھلا۔ وہ جھنجھلا کر چیخنے لگا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ اس وقت نشے میں وحشت ہو رہا تھا۔ غصّہ میں بوکھلا کر اٹھا اور والد مرحوم کی کمر پر کئی ٹھوکریں لگا دیں۔"

والفورڈ نے جھٹ سے کہا۔ "بڑا بدتمیز آدمی تھا۔"

خان بہادر نے جواب دیا۔ "تھا تو بدتمیز آدمی مگر دل کا برا نہیں تھا۔ چنانچہ ٹھوکریں مارنے کے بعد ذرا دیر تک تو خاموش بیٹھا رہا۔ پھر خود ہی اس نے اپنی غلطی کو محسوس کیا۔ کہنے لگا۔

"ول اماجی ہم نے تمہارے کے ٹھوکر مارا۔" والد مرحوم نے کہا "حضور ۶ ٹھوکریں تو مجھ کو یاد ہیں آگے آپ کو خبر ہو گی۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اچھا جاؤ تم کو ۶ گاؤں بخشش کئے۔" والد مرحوم نے جھک کر آداب کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ پوچھنے لگا۔ "اب تم کیا چاہتے ہو؟" انہوں نے برجستہ کہا۔ "حضور یہ جوتا بھی مجھ کو عنایت ہو جائے۔ تو بڑی مہربانی ہو گی۔ میں اس کو

یادگار کے طور پر رکھوں گا۔ کمشنر اس بات پر بے حد خوش ہؤا۔ وہ گاؤں اس نے جاگیر میں بڑھا دیئے اور یہ جوتا پیر سے نکال کر دے دیا۔"

بات کہتے کہتے خان بہادر کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے پلٹ کر اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو دیکھا جو بڑی سعادت مندی سے گردن جھکائے ان کی گفت گو سن رہا تھا خان بہادر ایک دم سے اس پر برس پڑا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ جاؤ لائبریری میں جا کر دیکھو وہاں اب تک کیا کیا گیا۔ ہم دونوں ابھی وہیں جا کر بیٹھیں گے۔ صاحب سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

پرائیویٹ سیکرٹری فوراً وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد خان بہادر گیلری کے دوسرے نوادرات کے متعلق والفورڈ سے باتیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گیلری کو عبور کر کے لائبریری کے اندر پہنچ گئے۔ لائبریری کے ایک حصہ میں الماریوں کے اندر سلیقہ کے ساتھ کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ جن میں بعض بڑے نایاب قلمی نسخے تھے۔ کتابوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے الماریوں کو کھول کر دیکھا بھی نہیں گیا۔ دراصل یہ کتابیں اس کشادہ کمرہ کی زیبائش کے لیے تھیں۔ جس کی چھت پر خوش رنگ فانوس لٹک رہے تھے۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھا تھا۔ درمیان میں

پرانی وضع کا صوفا سیٹ تھا۔ جس پر سرخ بانات کا غلاف بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار کے قریب سنگِ مرمر کا ایک مجسمہ تھا۔ جو اس طویل محرابوں والے کمرے میں بڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

دونوں کے وہاں پہنچتے ہی ایک خانساماں نے میز پر شراب کے قرابے اور گُلِ لالہ کی طرح کے مخروطی گلاس میز پر چن دیئے اس وقت فضا میں قدرے گھٹن تھی۔ خان بہادر نے تمام دریچے کھلوا دیئے۔ اور شراب کا دور چلنے لگا۔

لحیم شحیم جسم والے والفورڈ کے روبرو فربہ اندام خان بہادر عبدالباقی بڑا حقیر نظر آ رہا تھا۔ اس وقت وہ بے حد مسرور تھا۔ اس کو خوشی تھی کہ عرصہ دراز کے بعد ایک قدردان ملا جس کے سامنے وہ اپنی خاندانی عظمت کا مظاہرہ کر سکتا تھا وہ بات بات پر بے تکلفی سے قہقہے لگاتا اور پھر اپنے اجداد کی شجاعت کا کوئی قصہ چھیڑ دیتا۔ لیکن والفورڈ اس وقت کسی گہری فکر میں غرق تھا۔ وہ اس معاہدہ کے متعلق سوچ رہا تھا جس پر ابھی اس کو خان بہادر سے گفت گو کرنا تھی کئی سال پہلے تک ہانگ کانگ میں اس کا ریشمی کپڑے کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ لیکن جب سے حکومتِ چین نے اس پر اپنے حق کا دعویٰ شروع کیا تھا دوسرے غیر ملکی تاجروں کی طرح اس نے بھی کارخانے کو اونے پونے فروخت کیا اور دوسرے ممالک میں کاروبار پھیلانے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اسی سلسلہ میں وہ یہاں بھی آیا تھا۔ مگر ریشم کے کارخانے کے بجائے

اس دفعہ وہ سنگھار کا سامان تیار کرنے والی فیکٹری تعمیر کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر تامل کرنے کے بعد اس نے خان بہادر سے کہا "میرا خیال ہے کہ معاہدہ کی شرائط آپ نے پڑھ لی ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت اس کے متعلق گفتگو ہو جائے۔" خان بہادر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"جی ہاں، نہ صرف میں نے ان کو پڑھ لیا ہے بلکہ اپنے قانونی مشیر سے بھی تبادلۂ خیال کر چکا ہوں۔ اس سے تو میں بالکل متفق ہوں۔ بیچ میں رخنہ آکر یہ پڑ گیا ہے۔ کہ میرے مزارع زمین چھوڑنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہے ہیں۔"

والفورڈ اس بات سے کچھ گھبرا سا گیا۔ کہنے لگا "یہ تو بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ مسئلہ طے ہوئے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" خان بہادر بڑے اطمینان سے بولا "آپ اس کی فکر نہ کریں، وہ تو میں طے کر لوں گا۔ مگر آپ کی اسکیم کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ٹوائیلٹ فیکٹری کے علاوہ، کیا کوئی اور سامان تیار کرنے کا کارخانہ قائم نہیں کیا جا سکتا؟"

والفورڈ نے جواب دیا "کیوں نہیں قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس ملک کی سیاہ فام اور بدصورت عورتوں کے لیے سنگھار کا سامان بھی بنیادی ضرورت ہے۔ عورت کا سب سے بڑا جوہر اس کا حُسن ہے۔ جس کو نکھارنے کے

لیے سرخی، پوڈر اور کریم آج بہت ضروری ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں جو اعداد و شمار اکٹھا کئے ہیں۔ ان کے مطابق ہر سال کروڑوں روپے کی ایسی اشیا بیرونی ممالک سے یہاں برآمد ہوتی ہیں۔ مال تو وہی تیار کیا جاتا ہے، جس کی بازار میں زیادہ مانگ ہو۔ کاروبار کا یہ بنیادی اصول ہے۔"

خان بہادر اس کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے کہنے لگا۔"سچ بات تو یہ ہے کہ میں ٹھہرا جاگیردار، یہ تجارتی نکتہ کہاں میری سمجھ میں آسکتا تھا۔ پھر آپ کی صلاحیتوں تک میری کہاں پہنچ۔"

والفورڈ نے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے کہ خان بہادر سخت باطونی آدمی تھا۔ . . . اس کے برعکس والفورڈ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے وقت کی قیمت کا ایک ایک پیسہ وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اپنا چرمی پورٹ فولیو اٹھایا اور اس میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکال کر میز پہ پھیلا دیا۔ یہ فیکٹری کی اسکیم تھی۔

وہ ابھی خان بہادر کو اسکیم کی تمام تفصیلات بتانے بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک پرائیویٹ سیکرٹری پریشانی کے عالم میں لائبریری کے اندر داخل ہوا۔ وہ سیدھا خان بہادر کے پاس پہنچا اور سرگوشی کے سے انداز میں جلدی جلدی بتانے لگا۔

"خان بہادر صاحب! کاشتکاروں پہ مزارعوں نے ہلہ بول دیا ہے وہ

مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے ہیں۔"

خان بہادر نے پوچھا۔"تم نے اب تک گولی کیوں نہیں چلوادی؟"

پرائیویٹ سیکرٹری بولا۔"کئی بار گولی چل چکی ہے، مگر وہ اسی طرح جمے ہوئے ہیں۔ چھپ چھپ کر پتھراؤ کر رہے ہیں۔ اب جو آپ کا حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے۔" خان بہادر کا چہرہ غصہ سے سرخ پڑ گیا تھا۔ تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"سالے کمینوں کی یہ ہمت۔ دیکھو جی جیسے بھی بنے۔ ان سب کو بے دخل کیا جائے گا۔ کچھ اپنے کارندے اور اکٹھا کر کے بھیج دو۔ بندوقوں کی باڑھ پر رکھ کر ایک ایک نمک حرام کے پرخچے اڑا دو۔ سالوں نے آخر سمجھا کیا ہے۔ ہماری زمین ہے ہم نہیں رکھتے، ان کے باپ کا کوئی اجارہ ہے جاؤ جا کر اپنے سامنے گولی چلواؤ۔"

پرائیویٹ سیکرٹری فوراً وہاں سے چل دیا۔ خان بہادر نے والفورڈ سے تھوڑی دیر کی غیر حاضری کی اجازت لی اور لائبریری سے باہر چلا گیا۔

باہر آ کر اس نے دوربین منگوائی اور اس کو ہاتھوں میں دبائے ہوئے اوپر چھت پر چلا گیا۔ دن اب ڈھلنے لگا تھا۔ محل کی دور تک پھیلی ہوئی چٹیل چھت پر زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ منڈیر کے پاس ایک جگہ پختہ چبوترے پر ایک قدیم وضع کی توپ رکھی ہوئی تھی۔ خان بہادر سیدھا اس

چبوترے پر پہنچا اور توپ سے بازو لٹکا کر اس نے آنکھوں سے دوربین لگائی۔ اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کی جانب دیکھنے لگا۔ مشرق کی جانب درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہاں ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا اور بندوق چلنے کی آوازیں چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

خان بہادر دوربین لگائے اس ہنگامۂ کارزار کو پوری توجہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ سامنے مزارعوں کی ٹولیاں، درختوں کی آڑ میں چھپ چھپ کر سنگ باری کر رہی تھیں۔ دوسری طرف اس کے کارندے تھے جو ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے مورچہ لگائے بڑی پھرتی کے ساتھ بندوقیں سر کر رہے تھے۔ کئی کسانوں کو اس نے زخمی ہو کر گرتے ہوئے دیکھا۔ اُن کے جسموں پر جیتا جاگتا خون بہتے ہوئے بھی دیکھا۔

لیکن یہ خون خرابہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ اس لیے کہ مزارع جلد ہی پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ بدحواس ہو کر بستی کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں عورتوں اور بچوں کا بہت بڑا جمگھٹا تھا۔ خان بہادر نے بھی چھت پر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے کہ والفورڈ نیچے لائبریری کے اندر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ابھی اس کو پرائیویٹ سیکرٹری سے پوری رپورٹ سننا تھی۔ اور پولیس کو واقعہ کی اطلاع بھجوانا تھی۔

جب وہ دوبارہ لائبریری کے اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا۔ والفورڈ

بڑا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ خان بہادر کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا:۔

"کیا باہر گولی چل رہی ہے؟"

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "ہاں کچھ مزارعوں نے گڑبڑ پھیلا رکھی تھی۔"

والفورڈ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"وہی بے دخلی کا قضیہ تھا۔ وہ زمین خالی کرنے میں بدمعاشی کر رہے تھے۔"

"تو پھر کیا ہوا اس کا؟"

والفورڈ اس وقت بچوں کی طرح جلدی جلدی سوالات کر رہا تھا۔ جس قدر وہ پریشان تھا۔ خان بہادر کے چہرے پر اسی قدر اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں کہنے لگا۔

"ہوتا کیا۔ وہ چار زخمی ہوئے۔ باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔"

وہ کہنے لگا۔ "مگر وہ بعد میں بھی تو گڑبڑ کر سکتے ہیں۔"

"اجی اب سالے کیا گڑبڑ کریں گے۔ میں آج ہی ان کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔ یہ تو روز کے قضیے ہیں۔ آپ ان باتوں کا تردد نہ کریں۔"

مگر والفورڈ اس کی باتوں سے پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔ اس نے میز پر سے اسکیم کے خاکے کو اٹھا کر پورٹ فولیو میں رکھ لیا۔ اور بے چینی سے

دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔ خان بہادر نے پوچھا۔

"یہ آپ نے اسکیم اٹھا کر کیوں رکھ لی؟"

ہالفورڈ نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس اسکیم پر اب کام نہیں ہو سکے گا۔ میں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔"

اس کے بعد اس نے رخصت ہونے کے لیے خان بہادر سے اجازت چاہی اور باہر جانے کے لیے دروازہ کی طرف چل دیا۔ خان بہادر نے اس کو روکنا بھی چاہا لیکن وہ اس وقت تک باہر جا چکا تھا۔ اس کی اس حرکت پر خان بہادر کو سخت تاؤ آیا۔ بڑبڑا کر بولا۔ "یہ سالا کوئی خاندانی انگریز نہیں تھا۔ ضرور اس کے نطفہ میں فرق ہوگا۔ یہ تو بڑا بزدل نکلا" اس کے بعد اس نے ایک پورا جام شراب کا ایک ہی گھونٹ میں چڑھا لیا اور غصہ سے جام کو اٹھا کر فرش پر ٹپک دیا۔

○

# تاریکی کا جال

پروفیسر کیانی نے مطالعہ کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا لیکن کمرے کے اندر نظریں پہنچتے ہی وہ وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے فرش پر اس کا نوجوان شاگرد دارا شکوہ منہ اوندھا ئے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف بے ترتیبی کے ساتھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

لمحہ بھر وہ دروازے کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔ ابھی اس نے سو، سوا سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ خود بخود اس کے قدم رک گئے۔ اچانک اس کو خیال آ گیا کہ اب وہ جائے گا کہاں اس وقت تو اس کو اپنے مطالعہ کے کمرے میں ہونا چاہیئے تھا۔ گھر سے باہر رہنے کے واسطے اس نے جو وقت مقرر کیا تھا

اس کا کوٹا اب ختم ہو چکا تھا۔ اس روز بھی وہ ٹھیک دس بجے واپس آ گیا تھا۔ ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر سے باہر چلا جاتا اور آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا ایڈورڈ کے بت تک جاتا۔ پارک کا چکر لگاتا اور واپسی پر علی محمد ٹیلر ماسٹر کی دوکان کے ساتھ والے چائے خانے میں ایک پیالی، گرم گرم چائے کی پیتا، وہاں سے نکل کر وہ اس سڑک سے ہوتا ہوا گھر کی جانب لوٹتا، جس پر دن کے وقت رکشہ چلانے پر چالان ہو جاتا تھا۔ اس کے اس پروگرام میں کبھی فرق پیدا نہیں ہوا۔

ذرا دیر بعد وہ پھر گھر کے اندر واپس آ گیا مطالعہ کے کمرے کے دروازہ پر پہنچ کر اس نے دیکھا، لیمپ کی اجلی روشنی میں دارا ابھی تک بے سدھ پڑا تھا اس نے جوتے اتار کر بغل میں دبائے اور چوروں کی طرح دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا۔

جوتے ایک طرف رکھ کر اس نے سلیپر پہنے اور کرسی پر تھکا ہوا سا جا کر بیٹھ گیا۔ کمرے اندر اس وقت کچھ حبس سا معلوم ہو رہا تھا، باہر کھلنے والی دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ ان کو کھولنے کے ارادے سے اٹھا مگر اس خیال سے وہاں تک نہ جا سکا کہ کہیں آہٹ سے دارا کی آنکھ نہ کھل جائے جو بازو پر سر رکھے مزے سے سو رہا تھا، پروفیسر کو اس کا اس طرح بے تکے پن سے سونا کچھ مناسب نہ معلوم ہوا، تکیہ وہاں کوئی موجود نہ تھا، لہٰذا اس نے کرسی

کا کشن اٹھایا اور اس کو لے کر دارا کے قریب پہنچ گیا۔ آہستہ سے اس کا سر اٹھایا اور کشن رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے دارا کی آنکھ کھل گئی وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگا وہ شرمسار سا ہو کر کہنے لگا۔

"میں ہرگز تمہاری نیند میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا مگر تم بے ڈھنگے پن سے سو رہے تھے۔ لو یہ کشن سر کے نیچے رکھ لو اور نیند کا لطف خراب نہ کرو۔"

ادھر دارا خود شرمندہ تھا کہ وہ پڑھتے پڑھتے اس طرح فرش پر کیوں سو گیا۔ آہستہ سے بولا "جی وہ ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ کل رات میں بہت دیر سے سویا تھا۔"

پروفیسر نے ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا "تم یہاں کس وقت آئے؟"

دارا نے جواب دیا "آپ کے جاتے ہی آ گیا تھا۔ کلو نے یہی بتایا تھا۔"

پروفیسر کے چہرے پر ناگواری کے اثرات پیدا ہوئے۔ جھنجھلائے ہوئے لہجہ میں کہنے لگے "کہاں ہے وہ کلو کا بچہ۔ میں نے ہزار دفعہ اس سے کہا کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں وہ جاگتا رہا کرے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ آج بھی جا کر سو گیا۔"

دارا نے پوچھا: کہیئے تو اسے جا کر جگا دوں۔"

پروفیسر نے اس بات پر اسے ڈانٹ دیا" نہیں، سوجانا اس کی غلطی تھی اب اس کو جا کر جگانا تمھاری غلطی ہوگی۔ نیند خراب کرنا ایک مجرمانہ فعل ہے۔"

اس کے بعد کمرے کے اندر خاموشی چھاگئی، دارا چپ چاپ فرش پر بکھری ہوئی کتابوں کو سمیٹنے لگا۔ اسی اثنا میں پروفیسر نے پوچھا:۔

"کیا پڑھ رہے تھے تم؟"

"دارا نے جواب دیا۔ مولیئر کا" ادارے" پڑھ رہا تھا۔ مولیئر کے متعلق پروفیسر آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے گہری نظروں سے دارا کو دیکھا اور بتانے لگا" مولیئر کے متعلق کوئی دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ عالمی ادب میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ گوئٹے نے کہا تھا، مولیئر اس قدر عظیم ہے کہ اس کو جب بھی پڑھو، ہر بار ایک نئی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ اس کی نقل کر سکے۔"

دارا کہنے لگا" میں نے آج ہی اس کو شروع کیا تھا سوچا تھا کہ ختم کر لوں تو آپ سے اس کے متعلق گفت گو کروں گا۔"

پروفیسر بولا" اس بات سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ تمہارا ادبی ذوق اب پاکیزہ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھ کو ایسے طلبا سے چڑھ ہے جو لندن ٹائمز کے لٹریری سپلیمنٹ یا اسی قبیل کے کسی اور اخبار میں کسی کتاب پر ریویو پڑھ کر، الٹی سیدھی کوئی

کتاب خریدلاتے ہیں اور ان کو پڑھ کر خواہ مخواہ انٹیلکچوئیل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

دارا نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے" پروفیسر اس وقت اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا اس نے فوراً اس کو ٹوک دیا "کوئی الحال تمہارا کوئی خیال نہیں۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ اب مزید گفتگو نہیں ہوگی۔"

لیکن دارا باز نہ آیا کہنے لگا "میں صرف اتنی بات کہنا چاہتا ہوں۔"

پروفیسر نے پھر اس کی بات کاٹ دی "میں نے کہہ دیا مسٹر اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں امتحان کی کاپیاں دیکھوں گا۔ جب تک تمہارا جی چاہے، بیٹھے پڑھتے رہو، اس کے بعد چپ چاپ چلے جانا۔"

دارا نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کتاب کھول کر پڑھنے لگا، پروفیسر نے اٹھ کر الماری کا تالا کھولا۔ امتحان کی کاپیاں نکالیں اور میز پر جھک کر ان کو دیکھنے لگا۔ کمرے کے اندر گہرا سکوت پھیل گیا۔

پروفیسر دیر تک بیٹھا کاپیاں دیکھتا رہا۔ سرخ پنسل سے جگہ جگہ مختلف نشان بناتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے بڑبڑانے لگا۔

"جاہل، نامعقول، میں اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔"

دارا نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھنے لگا "کچھ مجھ سے کہا آپ نے۔"

پروفیسر نے گھور کر اس کو دیکھا اور ناراض ہو کر بولا "کیا تم بھول گئے کہ

کہ ابھی میں نے تم سے کہا تھا کہ تم کوئی بات نہیں کرو گے" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر ذرا دھیمے لہجہ میں کہنے لگا "تمہیں بھی یہ بات معلوم ہونا چاہیئے یہ ایک ایسے طالب علم کی کاپی ہے جو ایم اے کی ڈگری لینا چاہتا ہے اور اس نالائق کو شیکسپیئر کے نام کے ہجے تک نہیں آتے ہیں۔ اس کو ایک نمبر نہیں دوں گا، صرف صفر، یہ سراسر جہالت ہے۔ میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

دارا نے جھجکتے ہوئے کہا "لیکن پروفیسر، یہ تو بڑی زیادتی ہوگی۔"

پروفیسر اور بھی بپھر گیا۔ تیز لہجہ میں بولا "تمہارے نزدیک یہ زیادتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کوئی غلط اقدام کر رہا ہوں۔"

دارا نے اس دفعہ بھی دھیمے لہجہ میں کہا "یہ میرا مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کچھ مارکس کاٹ لیں۔"

پروفیسر بگڑ کر بولا "تمہارا خیال بالکل احمقانہ ہے، مسٹر یہ ادب ہے اس کی اقدار صدیوں میں وضع ہوتی ہیں، یہ ریگستان میں آلو اگانے کا تجربہ نہیں ہے۔"

دارا نے برجستہ جواب دیا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شیکسپیئر پڑھنے کے بعد، ریگستان میں آلو اگانے کا تجربہ کرنا پڑے۔ آپ نے ادبی اقدار تو وضع کر لیں لیکن انسانی محنت کی اقدار وضع نہ کر سکے۔"

پروفیسر اس کو ایک ٹک گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا "تمہارے

خیالات کچھ اشتراکی ہونے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہارا معدہ کچھ گڑبڑ ہے معدے کے فتور ہی سے ہمیشہ اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں تم فوراً سرکُل ہو جاؤ۔"

دارا خاموش بیٹھا رہا۔

پروفیسر نے دوبارہ کہا: "میں کہتا ہوں تم سرکُل ہو جاؤ۔"

وہ پوچھنے لگا "پروفیسر، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

پروفیسر بولا۔ "میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ تم سر کے بل کھڑے ہو جاؤ۔ یہ یوگ کا بڑا کارآمد آسن ہے۔ اس سے خون دماغ کی شریانوں میں تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے اس سے معدے کو تقویت اور دماغ کو فرحت ملتی ہے۔ تم روزانہ کچھ دیر تک یہ آسن لگایا کرو۔" دارا کے لیے یہ لمحہ بڑا عبرت ناک تھا اس کے نزدیک یہ سراسر حماقت تھی مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ پروفیسر کی بات بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔

وہ ذرا دیر تک تذبذب کے عالم میں گم صم بیٹھا رہا۔ لیکن جب پروفیسر اس کے سر ہی ہو گیا تو مجبوراً اس نے پروفیسر کی ہدایت کے مطابق سر جھکا کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ٹکایا اور ٹانگیں اونچی کرنے لگا پہلے سے چونکہ مشق نہ تھی۔ اس لیے ٹانگیں بلند کرتے ہی جسمانی توازن برقرار نہ رہ سکا اور وہ قلابازی کھا کر میز پر جا گرا۔ جو شور کرتی ہوئی الٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کئی کرسیاں، کتابیں اور ایسی ہی کئی اور چیزیں لڑھکتی ہوئی فرش پر بے ترتیبی سے

بکھر گئیں، دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ کباڑیے کی دکان بن گیا، پروفیسر کو ایک بارگی غصہ آ گیا۔ بگڑ کر بولا۔

"تم انسانی محنت کی اقدار کی پاس نہیں کرتے ہو اور تم کو سریل کی بھی تمیز نہیں اب تم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً کمرے سے باہر چلے جاؤ۔"

دارا نے جو بقول پروفیسر کے اشتراکی خیالات رکھتا تھا اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ فوراً کمرے سے چلا جائے۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر بے چینی کے عالم میں کمرے کے اندر ٹہلنے لگا۔

ٹہلتے ٹہلتے ایکا ایکی اس کو خیال آ گیا کہیں اس نے دارا شکوہ کو کمرے سے باہر نکال کر کوئی نازیبا حرکت تو نہیں کی۔ جتنا زیادہ وہ اس بات پر غور کرتا گیا اسی قدر اس کو یہ شبہ ہوتا گیا کہ اس کا اقدام مناسب نہیں تھا۔ اور جب اس کو یقین ہو گیا کہ اس کی حرکت درست نہیں تھی تو وہ اپنے متعلق سوچنے لگا کہ کہیں اس کا معدہ تو خراب نہیں ہے۔ ورنہ ایسی نازیبا بات اس کے ذہن میں کیوں آتی۔ ضرور کوئی ایسی ہی گڑبڑ ہے۔ اس نے فوراً جسم پر سے تمام کپڑے اتارے اور صرف انڈرویئر پہنے ہوئے فرش پر سر کے بل کھڑا ہو گیا۔

اس عالم میں اس کو مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک کمرے کے باہر بھاری قدموں سے چلنے کی آواز سنائی دی۔ پروفیسر آواز پر پوری طرح توجہ بھی نہ دینے پایا تھا کہ اسی اثنا میں تین بڑے لحیم شحیم آدمی کمرے

کے اندر گھس آئے انہوں نے کمرے کے بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ سر کے بل کھڑے ہوئے نیم برہنہ پروفیسر کو دیکھا اور حیرت سے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

پروفیسر اسی طرح آسن جمائے سر کے بل کھڑا رہا۔ وہ آدمی عین اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے ان کی وضع قطع کا جائزہ لیا اور بڑی بے نیازی سے بولا:۔

"معلوم ہوتا ہے آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ یہ پروفیسر صفدر علی کیانی کا مکان ہے کسی پٹواری کی بیٹھک نہیں ہے۔ آپ براہِ کرم باہر چلے جائیں میں اس قسم کے دخل در معقولات ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور پھر ان میں سے کسی نے کہا "یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں جی، یہ تو کوئی اور لگتا ہے اس کا حلیہ تو کچھ اور بتایا تھا۔"

"داڑھی تو ویسی ہی نوک دار ہے اور سر بھی گنجا ہے۔"

جس آدمی نے یہ بات کہی تھی وہ بڑھ کر پروفیسر کے پاس آ گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔ "تم ہی پروفیسر ہو؟"

پروفیسر پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا اور بگڑ کر بولا "ہاں میرا نام پروفیسر کیانی ہے لیکن تم مجھ سے ملنے ہرگز نہیں آ سکتے ہیں سنے کہ دیا تم غلط جگہ

آ گئے ہو۔"

وہ بولا۔"تم آدمی کی طرح تو کھڑے ہو۔"

پروفیسر اپنی بات پر اڑا رہا۔"تم سے جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔ میں ۲۵ منٹ سے پہلے آسن نہیں چھوڑ سکتا۔ ابھی صرف پانچ منٹ گزرے ہیں۔ اس آسن کی مقررہ مدت نصف گھنٹہ ہے اگر درمیان میں ختم کر دیا جائے۔ تو بینائی پر برا اثر پڑتا ہے بلکہ ریڑھ کی ہڈی پر بھی ضرب لگ جانے کا خدشہ ہے۔"

وہ ابھی آسن کے متعلق نہ جانے کتنی دیر گوہر افشانی کرتا، مگر وہ تینوں لحیم شحیم اجنبی، جو وضع قطع سے بالکل بوچڑ معلوم ہوتے تھے۔ اس کی بلاغت سے استفادہ نہ کر سکے بلکہ وہ آدمی جو اس کے پاس کھڑا تھا اس نے پروفیسر کی کمر پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اس کو سیدھا کھڑا کر دیا۔

پروفیسر ناراض ہو کر بولا۔"یہ قوت کا بے جا استعمال ہے۔ آپ نے سخت چھچھورے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔"

وہ آدمی بولا۔"بس اب تم ہمارے ساتھ چپ چاپ چلے چلو۔"

پروفیسر حیرت زدہ ہو کر بولا۔"کہاں؟"

"جہاں ہم لے جائیں۔"

"میں تو صبح ۷ بج کر ۳۵ منٹ سے پہلے گھر سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوئی بات نہیں" اس آدمی نے کہا۔"ہم نکال لے چلیں گے۔" اتنا کہہ کر

اس نے پروفیسر کا بازو پکڑا اور دروازے کی طرف گھسیٹ کر کہنے لگا۔ "بس اب خاموشی سے چلے چلو، خواہ مخواہ چوٹ چپیٹ آجائے گی۔"

پروفیسر ایک ہی جھٹکے میں حواس باختہ ہو گیا تھا کہنے لگا۔ "لیکن میں اس حلیے کے ساتھ کیسے چل سکتا ہوں۔ کپڑے تو بدل لوں۔"

"بس یونہی چلے آؤ، ہم کو تو حکم ملا ہے کہ جس طرح بیٹھے ہو اسی حالت میں لے آؤ۔"

پروفیسر بولا۔ "کس نے یہ حکم دیا؟"

"آپ چل کر خود ہی دیکھ لینا۔"

پروفیسر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ان میں سے ایک نے لپک کر اس کو بازوؤں پہ اٹھا لیا۔ وہ چڑھ کر بولا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

دوسرے نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

وہ اسی طرح اس کو بازوؤں پہ اٹھائے ہوئے گھر سے باہر لے آئے۔ دروازے پر ایک لمبی سی سیاہ کار کھڑی تھی۔ انہوں نے اس کو لے جا کر اس کے اندر ڈال دیا انہوں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ذرا سی دیر میں کار ہوا سے باتیں کرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔ کچھ دیر تک پروفیسر گم سم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا، دو آدمی منکر نکیر کی طرح اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے ایک اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا وہ سوچنے لگا آخر یہ تینوں مجھ

کو اس طرح زبردستی زنغے میں لے کر کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں اس طرح مجھ کو اغوا کر کے یہ لوگ لیے جا رہے ہیں؟ اور اسی قسم کے نہ معلوم کتنے ہی سوالات اس کے ذہن میں چوہوں کی طرح بلوں سے منہ نکال نکال کر جھانکنے لگے۔

کچھ دیر بعد کار ایک پٹرول پمپ کے قریب جا کر رکی۔ ڈرائیور کو موبل آئل کی ضرورت تھی وہ تینوں ڈرائیور سمیت اتر کر باہر چلے گئے۔ کار کا دروازہ کھلا تھا۔ پروفیسر نے جھجکتے ہوئے جسم کا تھوڑا سا حصہ باہر نکالا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا موقع غنیمت ہے اگر تھوڑی سی ہمت سے کام لیا جائے تو ان مشٹنڈوں کی حراست سے نجات مل جائے گی۔ کچھ بھی سوچ کر وہ کار سے باہر آ گیا۔ ابھی وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک آدمی کار کی اگلی سیٹ پر جھانکتے ہوئے بولا:

"یار نمبر الکلینز کہاں ہے؟"

اسی وقت اس کی نظر پروفیسر پر جا پہنچی، اس نے ننگ دھڑنگ دبلے پتلے پروفیسر کو دیکھا جو خالی انڈرویئر پہنے بالکل اُلّو کا پٹھا نظر آ رہا تھا۔ وہ آدمی ڈانٹ کر بولا۔" ابے ہم تجھ کو یہاں دیکھ رہے ہیں اور تو وہاں کھڑا ہے چل بیٹھ چل کر اندر۔" پروفیسر اس بدتہذیبی پر جل بھن کر کباب ہو گیا، مگر اس آدمی نے اس کی ناراضگی پر توجہ دیے بغیر، گردن پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا۔

"ابے چل رہا ہے یا لگاؤں سالے کے ایک ہاتھ۔"

پروفیسر سہم کر رہ گیا، چپ چاپ اس کے ہمراہ چل دیا۔ اس نے موبل آئل کا ٹین اٹھایا اور اس کو لا کر اگلی سیٹ کے پاس رکھ دیا۔ اور چپ چاپ پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا، کہ زیادہ دیر باہر رہا تو نہ جانے اور کیا مصیبت نازل ہو جائے۔

ذرا ہی دیر بعد وہ سب واپس آ گئے وہ اس وقت خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی اور وہ فرّاٹے بھرتی ہوئی سنسان سڑک پر روانہ ہو گئی۔ ابھی مشکل سے میل بھر کا راستہ طے ہوا ہوگا کہ انہوں نے پھر کار ٹھہرالی۔ اس مرتبہ کار کسی چائے خانے کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن اب کی وہ باہر نہیں گئے۔ ان میں سے ایک نے چائے خانے کے مالک کو آواز دے کر چائے لانے کا آرڈر دے دیا۔ فوراً ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی چائے کی پیالیاں لیے موٹر کے پاس آیا۔ اس نے سب کو چائے دی۔ جب پروفیسر کی باری آئی تو وہ اس کو کسی قدر حیرت سے دیکھنے لگا۔ برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے ڈانٹ کر کہا:۔

"ابے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے، جھک کر سلام کر۔ جانتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ کبھی پیر جھنڈے شاہ کو دیکھا ہے، نہیں دیکھا تو دیکھ لے۔ تیرے سامنے بیٹھے ہیں۔"

وہ تینوں اس وقت دل لگی کے موڈ میں تھے۔ مگر ادھیڑ عمر کے بیرے پر اس بات کا نہ جانے کیا اثر ہوا کہ اس نے جھٹ پروفیسر کے پاؤں پکڑ لیے اور..... گڑگڑانے لگا۔

"سائیں بابا۔ بس ایک عرض ہے۔ صرف اتنی دعا کر دو کہ میری بیٹی گھر آ جائے اس کی سسرال والے سالے اپنی ماں کے یار ہیں تین سال سے اس کو نہیں بھیجا۔"

پروفیسر نے اپنے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی اور ڈانٹ کر بولا۔

"یہ کیا نامعقول حرکت ہے۔"

مگر وہ باز نہ آیا۔ جتنا پروفیسر اس پر ناراض ہوتا وہ اتنا ہی زیادہ خوشامد کرتا۔ اس نئی مصیبت نے پروفیسر کو اس قدر پریشان کر دیا کہ وہ غصہ سے چیخنے لگا۔ مگر اس شخص کی ایک ہی رٹ تھی۔ "بس ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو" پروفیسر نے انتہائی غصہ میں اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے لوگ جو اس چپقلش سے لطف اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ خواہ مخواہ کار رکی ہوئی ہے لہذا ایک نے اس کو ڈانٹ کر کہا:

"بس جا اب تیرا کام بن گیا۔ جھنڈے شاہ جس پر تھوک دیں سمجھو اس کا بیڑا پار ہے۔"

وہ شخص دعائیں دیتا ہوا فوراً وہاں سے چل دیا۔ البتہ پروفیسر تقریباً

پاگل ہو گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ تینوں کو کچا چبا جاتا۔ مگر ان میں سے ہر ایک اس قدر موٹا تگڑا تھا کہ ان کو دیکھ کر ہی وہ احساس کمزوری میں مبتلا ہو جاتا کار فراٹے بھرتی ہوئی چلتی رہی اور پروفیسر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ دیکھیئے۔ اب کون سی مصیبت نازل ہوتی ہے۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد کار ایک بڑی شاندار کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی پہلے وہ تینوں باہر نکلے۔ پھر انہوں نے پروفیسر کو کار سے باہر نکالا اور اپنے نرغہ میں لے کر کشاں کشاں کوٹھی کے اندر چل دیے۔

وہ ان کی حراست میں ایک پر تکلف کمرے کے اندر داخل ہوا۔ سامنے صوفے پر ایک بھاری بھرکم شخص آلتی پالتی مارے بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا اس کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا یہ انداز پروفیسر کو بے حد ناشائستہ معلوم ہوا۔ وہ اس کو دیکھتے ہی بولا۔

”آپ ہی پروفیسر کیانی ہیں؟“

پروفیسر جل کر بولا ”جی ہاں اسی گرفتار بلا کو کیانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔“

وہ کہنے لگا ”معاف کیجیئے گا میں نے آپ کو اس وقت زحمت دی۔“ پھر وہ ان تینوں آدمیوں سے بولا ”معلوم ہوتا ہے تم نے پروفیسر صاحب کو بہت تکلیف دی ہے۔ کم از کم لباس تو تبدیل کر لینے دیا ہوتا۔“

پھر وہ مکاری سے چہرے پر غصہ کا عالم طاری کر کے ان پہ چلانے لگا۔ اور ڈانٹ کر سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد اس نے پروفیسر سے معذرت کی اور اس کو لے جا کر صوفہ پہ بٹھا دیا۔

پروفیسر جلا بھنا سا جا کر بیٹھ گیا، وہ بھاری بھر کم آدمی کہنے لگا "پروفیسر صاحب میں نے دراصل آپ کو اس وقت اس لیے تکلیف دی کہ کل دس بجے دن کو مجھے، سماجی بہبودی کی کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کرنا ہے۔"

پروفیسر جھنجھلا کر بولا۔ "تو پھر آپ نے کسی ڈاکٹر کو بلایا ہوتا، جو آپ کے لیے کوئی ایسی دوا تجویز کرتا کہ صدارت کرنے وقت آپ پہ اعصاب زدگی کا دورہ نہ پڑے میں کیا کر سکتا ہوں۔" اس نے پروفیسر کی بات کا ذرا بھی برا نہ مانا خوشامد کرنے کے انداز میں مسکرا کر کہنے لگا۔

"دراصل میرا کام آپ ہی سے ہے۔ مجھ کو ایک خطبۂ صدارت کی ضرورت ہے اور وہ آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔"

پروفیسر بھنا کر بولا۔ "آپ نے خطبۂ صدارت لکھانے کا طریقہ بہت اچھا نکالا ہے۔" وہ بے حیائی سے ہنستا رہا۔

"بات یہ ہے۔" اس نے کہا۔ "کانفرنس والوں نے آج ہی شام اطلاع دی ہے کہ کل کے اجلاس کی صدارت مجھ کو کرنا ہے۔"

پروفیسر نے اسی تیز لہجہ میں جواب دیا "لیکن اس وقت میں کوئی بھی ذہنی کام نہیں کر سکتا۔"

وہ بولا "میں آپ کو اس کا دو ہزار روپیہ معاوضہ دوں گا۔"

پروفیسر نے اس کو گھور کر دیکھا "میں اس قسم کی سودے بازی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"چلیئے ۳ ہزار لے لیجیئے۔ دیکھیئے اب انکار نہ کیجیئے۔ تین ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اتنے سرمایہ سے نمک کی آڑھت کا کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ آپ وہ قیمتی کتابیں خرید سکتے ہیں جن کو لائبریری میں دیکھ کر اکثر چوری کرنے کی بھی نیت ہو جاتی ہے۔"

اس دفعہ پروفیسر کو اس کی باتیں زیادہ ناگوار نہ گزریں۔ اس کا انداز قطعی کاروباری تھا مگر اس میں ذہانت ضرور تھی لیکن وہ اس کی بات پھر بھی قبول نہ کر سکا۔ کہنے لگا "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔"

"دیکھیئے میں آپ کو چار ہزار ٹکے دوں گا، غور تو کیجیئے۔ یہ خاصا بڑا آفر ہے۔ اتنے روپے سے آپ ایک اچھی خاصی سیکنڈ ہینڈ کار خرید سکتے ہو۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آج کل کار زندگی میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ کار موجود ہو تو بغیر سفارشوں کے ہی دفتروں میں کام چل جاتا ہے لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کے لیے۔"

اچانک اس کی نظر پروفیسر کی فرنچ کٹ سفید ڈاڑھی پر جا پہنچی۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور مسکرا کر اس کو دیکھنے لگا، پروفیسر کو وہ بھاری بھرکم آدمی اب خاصہ دلچسپ نظر آنے لگا تھا وہ اس کے ہر انکار پر معاوضہ کی رقم بڑھاتا جا رہا تھا۔ ہر پیش کش کے ساتھ وہ دولت کی اہمیت کا ایک نیا پہلو پیش کرتا۔ آخر رقم کی تعداد سات ہزار تک پہنچ گئی۔ اس مرتبہ وہ بولا:-

"سات ہزار میری آخری پیش کش ہے۔ اس کو نہ قبول کرنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس رقم سے آپ ایئر فرانس کا بیزنل ٹکٹ خرید کر پورے یورپ کی سیر کر سکتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے۔"

پروفیسر نے اس کی بات کاٹ دی "اچھا ہوا کہ آپ نے آخری پیش کش کا اظہار کر دیا۔ میں اپنا آخری جواب دینے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ آپ کل کانفرنس کے اجلاس کی صدارت نہ کریں"

وہ بولا "ایسا بھی ہو سکتا تھا مگر مشکل یہ ہے کہ کانفرنس کے منتظمین کا فنڈ کم پڑ گیا تھا لہٰذا وہ مجھ سے دس ہزار کا عطیہ لے گئے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ عطیہ دینے کے بعد صدارت مجھ پر فرض ہو گئی ہے"۔

پروفیسر کا انداز ذرا بھی تبدیل نہ ہوا "میں ایک بار نہیں، بار بار کہہ چکا کہ میں ہرگز ایسا کام نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے سمجھے آپ"

وہ بولا۔" لیکن میں دس ہزار روپے کا نقصان بھی تو نہیں برداشت کر سکتا۔"

"مجھ کو آپ سے پوری پوری ہمدردی ہے۔"

ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگا۔" دیکھیے میں رقم میں مزید اضافہ نہیں کر سکتا میرا تخمینہ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ کاروبار میں، میں تخمینہ کی اہمیت کا سختی سے قائل ہوں۔"

پروفیسر اس کی باتوں سے یونہی کم حیرت زدہ نہیں تھا یہ بات سن کر وہ اچھل پڑا۔" کانفرنس کی صدارت اور کاروبار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ قطعی مہمل بات ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔"

وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔" فی الحال میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ اگر کبھی ڈیل بن گیا تو آپ کو یہ نکتہ سمجھا سکوں گا، اس وقت تو آپ خطبۂ صدارت لکھ دیجیے۔ یقین مانیے میں کسی اور پروفیسر کو بھی بلا سکتا تھا۔ مگر اس موضوع پر سنا ہے کہ اس شہر میں آپ سے بہتر کوئی اور کام کا آدمی نہیں مل سکتا۔"

پروفیسر جھٹ سے بولا۔" بالکل غلط، یہ ڈاکٹر نازش کی توہین ہے۔ وہ سماجی علوم کے ماہر ہیں، میں تو انگریزی ادب پڑھاتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا۔" یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہ بتائی اگر آپ تیار نہیں ہیں تو پھر میں انہی کو بلائے لیتا ہوں۔" پروفیسر چونک پڑا۔" ہائیں آپ اس وقت اس معزز شخص کو پریشان کریں گے، بہت ممکن ہے کہ وہ ابھی تک لائبریری

میں بیٹھا مطالعہ میں غرق ہو اور آپ کے یہ اجڈ آدمی جا کر اس کو گرفتار کر کے لے آئیں گے بالکل میری طرح، یہ کبھی نہیں ہو سکتا، میں ایسی بات سننا نہیں چاہتا۔"

"کیا کیا جائے آپ تیار نہیں ہوتے، مجبوراً انہی کو.... بلوانا پڑے گا۔"

پروفیسر اور ناراض ہو گیا۔ "میں آپ پر حبسِ بے جا کا مقدمہ چلا دوں گا۔"

وہ کہنے لگا۔ "آپ چاہیں تو اقدامِ قتل کا الزام بھی میرے خلاف مہیا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ آپ کل کریں گے میرا کام آج ہونا چاہیئے میں ابھی ڈاکٹر نازش کو بلواتا ہوں۔"

پروفیسر گھبرا گیا اس نے وحشت ناک نظروں سے اس کو دیکھا اور بے چینی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے سوچا کہ یہ کتنا عبرت ناک منظر ہو گا۔ ڈاکٹر نازش کسی کتاب پر جھکا مطالعہ میں منہمک ہو گا۔ اب تو رات آدھی کے قریب ہو گئی ہے۔ مطالعہ میں جو لذت ہے جو لطف ہے وہ اسی وقت اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ یہ کتنا ظلم ہو گا کہ ایسے عالم میں جب کہ ڈاکٹر کسی خیال کو مکمل کرنے میں ڈوبا ہو کہ اچانک کھڑکی کے راستے تین دیو قامت انسان کود کر آئیں اور زبردستی پکڑ کر اس آدمی کے پاس لے آئیں جو اپنے احمقانہ مشاغل کے لیے شریف شہریوں کو اس طرح پریشان کرتا ہے۔" اس نے گھور کر اس شخص کو دیکھا، اور پھر زچ ہو کر کہنے لگا۔

"چلیے میں تیار ہوں - آپ کی کوٹھی میں کوئی ایسا بھی کمرہ ہے - جہاں میں سکون سے بیٹھ کر لکھ سکوں۔"

وہ کہنے لگا - "آپ لائبریری میں چلیئے اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے؟"

پروفیسر چپ چاپ اس کے ہمراہ لائبریری میں چلا گیا، یہاں آبنوس کی خوب صورت الماریوں کے اندر بڑی نایاب کتابیں قرینہ سے سجی تھیں ان میں بعض ایسی کتابیں تھیں جن کی تلاش میں وہ مہینوں سرگرداں رہا تھا۔ یہ بات بھی اس کو سخت ناگوار گزری - اس لیے کہ کسی ایسے شخص کے پاس ایسی نادر کتابوں کا ہونا، علم و ادب کی توہین تھی۔

وہ آدمی کچھ الٹے سیدھے پوائنٹ بتا کر لائبریری سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے کاغذ لیا - اور انتہائی جھنجلاہٹ کے عالم میں لکھنا شروع کر دیا - کبھی اس کا جی چاہتا کہ لکھے ہوئے کاغذات کو چیر پھاڑ کر بھاگ جائے ، زور زور سے چلّانے لگے - کبھی وہ بے چینی سے اٹھ کر خارش زدہ کتے کی طرح لائبریری کے اندر چکر کاٹنے لگتا - گھنٹوں یہی سلسلہ چلتا رہا - لیکن جب وہ اس کو مکمل کر چکا تو وہ کسی قدر مطمئن تھا - اس نے خطبہ صدارت کو مہمل بنانے میں اپنی طرف سے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی - ایسے ایسے فلسفیوں کے نام لکھے تھے - جن کی ابھی تک مائیں بھی پیدا

نہیں ہوئی تھیں۔ جن کی کوکھ سے وہ جنم لیتے۔ ایسے ایسے دل چسپ انکشافات کیے تھے کہ اکثر تو وہ خود بھی مسکرانے لگا بلکہ ایک بار تو اس کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور وہ دیر تک ہنستا رہا۔

جب وہ لائبریری سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی کوٹھی پر گہرا سناٹا طاری تھا مگر وہ سماجی بہبود کی کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کرنے والا ابھی تک جاگ رہا تھا اس نے کاغذات سنبھالے اور پروفیسر کو اسی وقت اس کے گھر کار میں بھجوا دیا۔

رات بھر جاگنے کے باعث پروفیسر کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا آنکھیں جل رہی تھیں اور جسم دکھنے لگا تھا۔ اس نے غسل کیا اور فوراً بستر پر جا کر سو گیا۔

اس روز وہ خلافِ معمول دن بھر سوتا رہا۔ سہ پہر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اٹھ کر چائے پی۔ ابھی تک اس کی طبیعت کسل مند تھی۔ پھر اس کو گزشتہ شب کے واقعات یاد آنے لگے۔ اپنے روز از پروگرام میں اتنی بڑی تبدیلی پر اس کو غصہ بھی آیا۔ مگر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اس نے اپنی ہر ذہنی تکلیف کا انتقام لے لیا تھا۔ اب اس کو شام کے اخبار کا انتظار تھا جس میں وہ کانفرنس کے اجلاس کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں وہ خطبہ پڑھا گیا ہو گا۔ جس کو اس نے کل رات لکھا تھا۔ اس نے سوچا کتنا اچھا

ہوتا کہ وہ خود اس اجتماع میں موجود ہوتا اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ صدر نے خطبۂ صدارت شروع کیا، پہلے حاضرین چونکے، پھر حیرت زدہ ہوئے رفتہ رفتہ سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ لوگوں کے چہرے مسکرانے لگے، پھر ایک ایک جملہ پر قہقہوں کی بارش، صدر کی بدحواسی، اس کا بار بار رومال سے پسینہ پونچھنا، واقعی یہ ایک پرلطف نظارہ ہوتا، وہ خاموش بیٹھا ان تصورات سے لطف اٹھاتا رہا۔

شام کا اخبار آتے ہی اس نے سب سے پہلے کانفرنس کی خبر کو تلاش کیا اس کو زیادہ دقت نہ ہوئی۔ پہلے ہی صفحہ پر نمایاں طور سے اس کو شائع کیا گیا تھا لیکن چند ہی جملے پڑھے ہوں گے کہ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا لکھا تھا

"آج کا اجلاس بے حد کامیاب رہا۔ حاضرین نے جناب صدر کے پُرمغز خطبہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔"

وہ آگے نہ پڑھ سکا۔ اخبار ایک طرف رکھ کر اس نے جلدی جلدی کتابوں کی الماریوں میں سے اپنی ساری لغات نکالیں۔ اور لفظ "پُر" اور "مغز" کے معنی تلاش کرنے لگا۔ مگر ہر لغت میں، ہر فرہنگ میں وہی معنی درج تھے جو اس کے ذہن میں تھے کوئی نئے معنی وہ تلاش بسیار کے باوجود نہ ڈھونڈ سکا"

اس نے اخبار اٹھا کر آگے پڑھا، ہر ہر جملہ خطبۂ صدارت کی عظمت

کی تعریف میں تھا۔ پروفیسر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جھنجھلا کر اخبار کے ٹکڑے کر ڈالے اور خارش زدہ کتے کی طرح کمرے کے اندر چکر کاٹنے لگا۔ اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو وہ فرش پر سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ جب کبھی اس کا دماغ بوجھل ہوتا تو وہ یہی نسخہ آزماتا تھا مگر آج اس سے بھی کام نہ چل سکا۔ منٹ بھر بھی وہ اس طرح یوگا کا آسن جمائے کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے اٹھ کر کئی گلاس پانی کے پیئے اور پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر نکل گیا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ہمراہ ایک موٹا تازہ گدھا تھا محلے والے حیرت سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ سب سے بے نیاز گدھے کو چمکارتا ہوا گھر کے اندر لے آیا اور سیدھا مطالعہ کے کمرے کے اندر لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گدھے کو جھک کر سلام کیا اور کہنے لگا۔

"قبلہ میں آج سے آپ کی شاگردی قبول کرتا ہوں، عمر عزیز کے ۵۶ سال جو گمراہی میں گزرے ان کا کچھ افسوس نہیں، غم اس بات کا ہے کہ میں نے آج تک آپ کی ذات والاصفات کو کیوں نہیں پہچانا یا پیرومرشد!"

یہ کہتے کہتے پروفیسر جوش عقیدت میں گدھے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس کو کھڑے کھڑے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے پروفیسر کے اس زور سے دولتی جھاڑی کہ اس کا جبڑا اکھڑ گیا اور کئی دانت نکل کر باہر گر پڑے۔"

پروفیسر آج کل اسپتال میں ہے۔ وہ ہر وقت نہ معلوم کیسی الٹی سیدھی

باتیں کیا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے ؎
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

# انٹرویو

آخر میں نے تھکے ہوئے انداز میں قلم ایک طرف رکھ دیا اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا کہ اب ہیبتو خاں کے ساتھ میرا کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اچانک کئی سوال میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔

کیا میں کرم داد کو بھی قتل کروا دوں؟

نہیں یہ مناسب نہیں۔ ہیبتو خاں کو گرفتار کروا دیا جائے تو؟

لیکن میں کچھ طے نہیں کر سکا۔ اس لیے کہ افسانہ ایک ایسے دوراہے پر آ گیا تھا جہاں سے ایسے حادثات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس سے ہیبتو خاں کا کردار اپنے تمام خدوخال کے ساتھ اجاگر ہو سکتا ہے لیکن ان حادثات کی کیا نوعیت ہو گی یہ قطعی بحث طلب مسئلہ تھا۔ لکھنے سے قبل میں نے افسانے

کا جوتا نا بانا تیار کیا تھا۔ وہ اس طرح مجھ کو تذبذب میں ڈال دے گا۔ اس کا مجھ کو ہرگز احساس نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض کردار آگے چل کر کچھ اس طرح بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں اسی طرح خاموش بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ سامنے دیوار کے پاس ایک آدمی کھڑا تھا اس کی آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ کپڑوں پر خون کے لال لال دھبے تھے۔ ہاتھ میں خون کے لوتھڑوں سے بھرا ہوا چاقو تھا۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ وہ ہیبتو خاں تھا۔ ایک بارگی اس نے گھور کر مجھ کو دیکھا اور تیز لہجے میں کہنے لگا۔

"تم ابھی تک سوچ رہے ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

میں نے اس کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا" گھبراؤ نہیں، ابھی بتاتا ہوں۔"

وہ بگڑ کر بولا" وہ سالا... کرم داد برابر دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے جلدی کرو، جلدی!"

میں نے پریشان ہو کر سوچا کہ یہ ہیبتو خاں تو اچھی خاصی مصیبت بن گیا ہے۔ وہ برابر مجھ کو گھور رہا تھا۔ ابھی تک خون آلود چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہیں اس عالم میں وہ جھنجھلا کر میرے اوپر بھی وار نہ کر بیٹھے لہٰذا

میں نے اس کو اکسایا۔ "تم کرم داد کو بھی کیوں نہیں ٹھکانے لگا دیتے؟"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن ـــ" وہ کہتے کہتے رک گیا اور کنپٹی کے بالوں کو کریدتے ہوئے ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر فوراً ہی کہنے لگا۔ "لیکن اس میں یہ بھی تو اندیشہ ہے کہ وہ شور مچا دے گا اور میں پکڑا جاؤں گا۔ یہ بھی ٹھیک نہیں کچھ اور بتاؤ۔"

میں نے کہا۔ "تو اس میں کیا حرج ہے، تم گرفتار ہو جاؤ۔"

مگر وہ رضامند نہ ہو سکا۔ کہنے لگا۔ "نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں اس کو سمجھانے لگا۔ "دیکھو ہیبتو خاں۔ بالی تمہاری منگیتر تھی۔ جب تم فوج میں بھرتی ہو کر جا رہے تھے تو اس نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔ مگر جب تم سنگاپور میں زخموں سے نڈھال پڑے ہوئے تھے تو وہ تمہارے باپ کو زہر دے کر کرم داد کے ساتھ فرار ہو گئی۔ تم ۱۵ سال سے پاگلوں کی طرح اس کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ آج وہ تم کو مل گئی۔ تم نے اپنے انتقام کی آگ بجھالی۔ اب تم کو جیل جانے میں کیا اعتراض ہے تم گھبراؤ نہیں۔ میں کچھ ہی عرصہ بعد تم کو جیل سے فرار کرا دوں گا۔"

لیکن وہ سرکشی پر آمادہ تھا۔ کہنے لگا۔ "یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ اس ۱۵ سال کی مدت میں میں نے اس کو کہاں، کہاں نہیں تلاش کیا۔ میں نے اس کو ذہنی طور پر کس کس طرح قتل نہیں کیا۔ مگر میں اس کو اس قدر آسانی

کے ساتھ مار ڈالوں گا۔ اس کا مجھ کو ہرگز احساس نہیں تھا۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر میں جیل کیوں جاؤں۔"

میں پھر الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ اب کیا کروں۔ ایکا ایکی وہ گھبرا کر بولا "جلدی کرو، وقت کم ہے۔ کرم داد دروازے کو زور زور سے کھٹ کھٹا رہا ہے۔ سوچنا بند کر دو۔ فوراً کوئی ترکیب نکالو۔" اب واقعی میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے تیزی سے کہا:۔

"جب ایسا ہی ارادہ ہے تو پھر تم میرا منہ کیوں تک رہے ہو۔ آنگن کی جس دیوار کو پھاند کر تم کوارٹر کے اندر گئے تھے۔ اس پہ چڑھ کر باہر نکل جاؤ۔"

وہ ایک بارگی مسکرا دیا۔ "بالکل ٹھیک!! اس بات کا تو مجھ کو خیال ہی نہیں آیا۔" لیکن وہ دروازہ تک جا کر واپس آ گیا۔ "مگر میرے کپڑے تو خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ گشت کرنے والے کانسٹیبل فوراً ہی پکڑ نہ لیں گے ــــ!"

اس دفعہ بھی مجھ کو اس کی مدد کرنا پڑی۔ "تو پھر ایسا کرو، کمرے میں جو پرانا اوورکوٹ پڑا ہے اس کو پہن کر چلے جاؤ۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور تیزی کے ساتھ دروازے کے باہر

نکل گیا۔ میں خاموشی سے سوچنے لگا اس وقت تو میں نے اس آفتِ ناگہانی کو ٹال دیا۔ مگر کچھ عرصے بعد ہیبتو خاں پھر نازل ہو جائے گا۔ اس لیے روپوش رکھنے سے بہتر ہو گا کہ اس کو جیل خانے بھجوا ہی دیا جائے۔ حالانکہ ابھی تو اس کو بہت کچھ کرنا ہے۔ لیکن اب میں اس کو پوری طرح قابو میں رکھوں گا۔

رات کا سناٹا برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذ کھڑکھڑانے لگتے تو گہری خاموشی میں ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ یکا یک کمرے کے اندر کراہنے کی بڑی دردناک آواز سنائی پڑی۔ میں نے تجسس انگیز نظروں سے ہر طرف دیکھا مگر کوئی بھی نظر نہ آیا۔

اس دفعہ کراہنے کی آواز اور بھی زیادہ درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دروازے پر ایک کبڑا سا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے بازوؤں پر اور داہنی ٹانگ پہ سفید سفید پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم اس قدر سیاہ تھا کہ وہ بے ہنگم سائے کی طرح ہیبت ناک معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن ہیبتو خاں تو ہرگز نہیں تھا۔ پھر کون ہو سکتا ہے۔ میں اس بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ اس کی آواز ابھری۔

"پہچان رہے ہو؟ ہاں اب تم مجھ کو کیوں جاننے لگے!"

اس کے لہجے میں بڑا زہریلا طنز تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا جواب دوں۔ مجھ کو خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی بتا دیا۔

"میں نیل کنٹھ ہوں۔ اب تو یاد آیا"۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "اچھا تو تم ہو نیل کنٹھ مہاراج! آؤ یہاں کرسی پر بیٹھ جاؤ"۔

وہ کبڑوں کی طرح جھک کر چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھ سے کھڑا نہیں رہا جاتا۔ میری داہنی ٹانگ تو تم نے بالکل بیکار کر کے رکھ دی"۔

"میں نے پوچھا "نیل کنٹھ مہاراج آج کیسے ادھر نکل آئے"؟

وہ ذرا دیر تک بے سُدھ پڑا کراہتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا، جو تم نے مجھ کو اس طرح زخمی کر کے چھوڑ دیا۔ میں پورے ۵ سال سے اس روگ کو بھگت رہا ہوں"۔ اور پھر وہ ہانپنے کے سے انداز میں لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا۔ مجھ کو اس پر بڑا ترس معلوم ہوا۔ لیکن مشکل یہ تھی۔ اب میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں۔ میں نے اس کو جنم دیا تھا۔ مگر اب وہ میری دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

"نیل کنٹھ مہاراج مجھ کو تم سے پوری ہم دردی ہے۔ مگر اب تو میں خود بھی مجبور ہوں"۔

وہ لمحظ بھر تک مجھ کو خون خوار نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر یک دم سے بھڑک کر کہنے لگا۔

"میں جانتا تھا کہ تم یہی جواب دو گے۔ میں تو کبھی یہاں آکر تھوکتا بھی نہیں مگر ان ڈاکٹروں کو کیا کہوں۔ جس سالے کے پاس گیا اس نے تمہارے پاس جانے کا مشورہ دیا۔"

میں نے ایک بار پھر معذرت کا اظہار کیا۔ "نیل کنٹھ مجھ کو بہت افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم کو اب اسی طرح زندہ رہنا ہوگا۔"

وہ اور بھی زیادہ ناراض ہو کر بولا۔ "تمہاری بلا سے میں چاہے جس طرح بھی رہوں۔ مگر اتنا سن لو کہ مجھ کو تم سے نفرت ہے۔ تم نے میرے ساتھ کبھی بھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ تم نے مجھ کو ایک عادی مجرم کے روپ میں پیش کیا۔ مگر کبھی یہ نہیں بتایا کہ میں جرائم پیشہ کس طرح بنا۔ تم نے مجھ پر سراسر ظلم ڈھایا ہے۔ کیا یہ تمہاری بددیانتی نہیں ہے؟"

میں نے غور کیا کہ نیل کنٹھ بالکل درست کہہ رہا ہے۔ واقعی مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ میں اس کی بات کو رد کر سکوں۔ اس سلسلہ میں کوئی تاویل پیش کرنا عذر گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ میں نے اس کے سامنے سپر ڈال دی۔ اور بہت آہستہ سے کہا:-

"نیل کنٹھ مہاراج! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں۔

دراصل بات یہ ہے کہ "کیوس" کچھ اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ میں اس پہلو پر توجہ دینا بھول گیا۔ اس فروگزاشت کے لیے میں تم سے معافی مانگنے کو آمادہ ہوں۔"

اس کے چہرے پر ایک بارگی کسی قدر تازگی آگئی۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "نہیں۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں باوجودیکہ تم نے میری جسمانی تکلیف رفع نہیں کی۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ تم نے میری آتما کو تو شانتی پہنچا دی۔"

میں چپ چاپ بیٹھا اس کو دیکھتا رہا۔ کمرے کے اندر ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اب نیل کنٹھ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ کرسی کے بازو کا سہارا لے کر کراہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور رخصت ہونے کے انداز میں کہنے لگا۔ "اچھا اب میں چل رہا ہوں۔" وہ لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا۔ لیکن ایک بارگی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں ایک بات اور یاد آگئی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ "تیسرا آدمی" کون ہے؟"

میں نے فوراً جواب دیا کہ "وہ تو تم ہی ہو۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور پھر کہنے لگا "یہ بات تو تم نے مجھے بتائی تھی۔ لیکن بہت سے لوگ مجھ کو اس حیثیت سے نہیں پہچانتے اس کے علاوہ وہ کچھ بھی مغالطہ پیدا کر دیتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو خواہ مخواہ رعب جماتا ہے۔ اب تو وہ میرے

قابو میں نہیں۔ ورنہ میں اس کو ڈانٹ دیتا کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ "چلو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اپنی بات پھر اپنی ہے۔" اور پھر وہ گبڑوں کی طرح جھک کر چلتا ہوا دروازہ سے آہستہ آہستہ باہر چلا گیا اس کے بھاری قدموں کی آہٹ دیر تک ابھرتی رہی۔ اور جب خاموشی چھا گئی تو میں سوچنے لگا کہ اب کون نازل ہوتا ہے۔ اگر نیل کنٹھ ہی کی طرح کے کسی بگڑے دل سے سابقہ پڑ گیا تو پھر خیر نہیں۔ ابھی میں آنے والے حادثہ کے لیے خود کو آمادہ بھی نہیں کر سکا تھا کہ اسی اثنا میں ایک طرف سے آواز آئی :-

"تم میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ لو میں آ گیا۔"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ میری پشت پر ایک آدمی کھڑا بڑے گھناؤنے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ نیم برہنہ جسم پر بے حد غلیظ لباس تھا۔ سینہ پر ایک گہرا گھاؤ تھا۔ جس سے برابر خون بہہ رہا تھا۔ شب کے ہولناک سناٹے میں وہ بڑا خوفناک نظر آ رہا تھا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا :-

"تم کون ہو؟"

اس دفعہ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ یہ قہقہہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ وہ ایک آنکھ دبا کر بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "اچھا تو اب یہ بھی بتانا

پڑے گا کہ میں کون ہوں۔ کیوں استاد اتنی جلدی بھول گئے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"تم کرشن چندر کے "کالو بھنگی" تو نہیں ہو؟"

وہ ایک دم ناراض ہو گیا۔ ڈانٹ کر کہنے لگا۔ "ہش! تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ میں تمہاری وہ تخلیق ہوں۔ جس پر تم کو بڑا ناز ہے۔" میں نے فوراً ہی اس کو شناخت کر لیا۔ اب ذرا جان میں جان آئی تو میں نے مسکرا کر کہا:۔

"بھئی معاف کرنا۔ تاتیا ابھی ابھی نیل کنٹھ یہاں سے گیا ہے اس نے مجھ کو کچھ اس قدر پریشان کر دیا تھا۔ کہ میں اب تک سنبھل نہیں سکا۔ میں بھلا تم کو بھول سکتا ہوں۔ تم پر تو نہ صرف میں نے ریاض کیا ہے۔ بلکہ میرے کمرے میں بیٹھ کر گھنٹوں کے کتنے ہی ادیبوں نے گھنٹوں ایک ایک زاویہ، ہر ہر پہلو سے تمہارا انجیئنز کیا ہے۔ مجھ کو بار بار تم پر محنت کرنا پڑی ہے۔ نئے نئے انداز سے تمہاری تخلیق کرنا پڑی ہے۔ سچ کہتا ہوں تم پر تو ـــــ!" وہ ایک دم میری بات کاٹ کر کہنے لگا۔

"کیوں خواہ مخواہ کی ڈینگ مارتے ہو۔ اپنا یہ رعب کسی اور پر جمانا۔ میں تم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

میں نے تیز لہجہ میں کہا "تو کیا یہ سب جھوٹ ہے؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا "یہ میں نے کب کہا۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ تم بے حد خطرناک آدمی ہو۔"

اس کی اس بات پر مجھ کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ میں جس قدر اس کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اسی قدر سر پر چڑھتا جا رہا تھا اس کے ہر انداز میں سرکشی تھی، بدتمیزی تھی۔ کم از کم میں اس کو اس طرح بات کرنے کی اجازت دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ناراض ہو کر کہا:۔

"دیکھو تانیا مجھ کو تمہارا یہ انداز بالکل پسند نہیں۔ تم زبان سنبھال کر بات کرو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تم مجھ سے گفتگو کر رہے ہو۔ ایک ایسے آدمی سے جس نے تم کو جنم دیا ہے۔ جس نے تم کو زندگی ودیعت کی ہے۔"

لیکن وہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ ڈھٹائی سے ہنس کر بولا "یہ سب کچھ کر کے تم نے مجھ پر کون سا احسان کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے مجھ کو قابلِ نفرت بنا کر پیش کیا ہے۔ تم نے نہ تو مجھ کو شائستگی دی نہ شعور، میں تو ایک وحشی انسان ہوں۔ جو انسانی دکھ درد پر قہقہہ لگاتا ہے ان کو ایذا پہنچانے میں آسودگی محسوس کرتا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کہ کیوں نہ تمہارا بھی گلا گھونٹ دوں۔ میں اس کی باتیں سنتے سنتے اچانک چونک پڑا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں

میں انسان کی ازلی وحشت تھی۔ اس کے چہرے پر سفاکی تھی، وحشت انگیزی تھی
بدحواس ہو کر میں نے غور کیا کہ یہ A B N O R M A L ٹائپ کا آدمی ہے
کہیں سچ مچ کسی خطرناک ارادے سے مجھ پر جھپٹ نہ پڑے۔ لہٰذا سر دست
یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کسی حد تک رواداری برتی جائے
میں اس کو منانے کے انداز میں بولا:۔

"تمہاری ان خصوصیات کو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ رہا میرا سوال
تو باوجودیکہ ایک عرصہ سے بالکل بے روزگار ہوں۔ ٹھاٹھ سے فاقہ کشی کرتا
ہوں۔ لیکن ابھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں"

وہ ہر طرح مجھ کو ستانے پر تلا ہوا تھا۔ گردن ہلا کر بولا "فاقہ کشی تو تمہاری
تقدیر میں لکھی ہے۔ اس لیے کہ تم ادیب ہو اور اتفاق سے ترقی پسند بھی ہو۔
تمہاری نجات تو اسی میں ہے کہ تم کو قتل کر دیا جائے" اس نے ایک وحشت انگیز
قہقہہ لگایا اور میرا گلا دبوچنے کے لئے اپنے بھدے ہاتھوں کو میری طرف
بڑھایا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر اپنی گردن پیچھے ہٹا لی۔ اور اس کے سامنے
گڑگڑانے لگا "خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔ ابھی تو میری بیوی کے ہاتھوں کی
مہندی بھی نہیں اتری۔ مجھ پہ تم کو ترس نہیں معلوم ہوتا۔ اس بیچاری کے
سہاگ پر تو تم کو رحم آنا چاہیئے۔ اتنے سنگ دل نہ بنو۔ تاتیا" وہ برابر گھناؤنی
ہنسی ہنستا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولا:۔

"جس وقت تم نے مجھ کو پیدا کیا تھا۔ اس وقت تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تم ایک ایسے کردار کو جنم دے رہے ہو۔ جس کے وجود سے تم نے ہر جذبۂ رحم کو جدا کر دیا ہے۔ جس سے تم نے ہر احساس ہمدردی چھین لیا ہے۔ جس کے خمیر میں تم نے ہر اذیت پسندی کو بھر دیا ہے۔ بتاؤ استاد ایسا آدمی سنگ دل نہیں ہو تو کیا ہوگا۔"

میں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور پسپائی کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں نے ایسے ہی انسانیت سوز جذبات کے ساتھ تم کو پیش کیا ہے۔" پھر لحظہ بھر رک کر میں نے اس کو ایک بار پھر ہموار کرنے کی کوشش کی۔ "لیکن یہ میرا قصور نہیں۔ یہ تو اس نظام کی برکت ہے جو تمہارے ایسے انسانوں کو جنم دیتا ہے۔ تم تو اس طبقہ کے ایک فرد ہو۔ جو سالہا سال سے ظلم سہہ رہا ہے۔ جس کی ہر نفرت جس کا ہر احتجاج اندر ہی اندر پھوڑے کی طرح پکتے رہے اور جب اس مادّے کو باہر نکلنے کا موقع نہ ملا تو وہ زہرآب بن گیا اور فسادات کے روپ میں لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔ جب انقلابی قوتوں کو پنپنے کا موقع نہیں ملتا تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے تم کو تو میں نے اس غارت گری کے ایک سمبل کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر ذرا نرم

لہجہ میں بولا:۔

"تمہاری باتیں کچھ کچھ تو میری سمجھ میں آتی ہیں۔ لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس تباہی میں بیرونی سامراج کا کتنا ہاتھ تھا؟"

اب وہ کسی قدر قابو میں آ چکا تھا۔ میں نے اس کو بڑے پیار سے ڈانٹ دیا۔ "دیکھو بھئی تانتیا! یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں ہیں۔ تم اپنی حدود سے باہر جا رہے ہو۔" وہ کھسیانا ہو کر بچوں کی طرح ہنسنے لگا۔ پھر گردن کو خم دے کر بولا:۔

"ہاں! یہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ایسی باتیں تو تم سے کامریڈ رندھیر پوچھ سکتا ہے۔ جس کی تم نے لاٹھی چارج میں آنکھ پھڑوا دی۔ اور بیچارے کو یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ یہ تو پولیس کے ظلم کی ایک مقدس یادگار ہے۔ پہلے پہل تو تم نے اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ اور پھر فرسٹریٹیڈ بنا کر ایک بارگی ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے ــــ!"

میں نے تیزی سے کہا۔ "اسی لیے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں۔ تم کو کیا پتہ کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ دراصل میں "ہیرو ورشپ" کا قائل نہیں۔ میں نے اس کو متوسط طبقہ کے ایک جذباتی باشعور نمائندے کی حیثیت سے ابھارا تھا۔ جہاں تک وہ کام دے سکا۔ اس کو استعمال کیا۔ لیکن جس وقت اس کے طبقے کی روایات

اس کا دامن پکڑنے لگیں اور وہ تذبذب میں الجھنے لگا۔ وہیں میں نے اس کو ختم کر دیا۔ اس لیے کہ انقلابی قوت تو محنت کش طبقہ ہے۔ جس میں بسنہ برگولی کھانے والے مرلی جنم لیتے ہیں۔ بہرحال ان باتوں کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارے گرد تو ایک حصار ہے تم اس سے آگے نہیں جا سکتے۔"

تانتیا آہستہ آہستہ کہنے لگا" یہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن تم نے رنادھیر کے متعلق جو کچھ کہا ہے یہ تو وہی بہتر جان سکتا ہے۔ کیا میں اس کو تمہارے پاس بھیج دوں؟" یہ بات سنکر میں واقعی گھبرا گیا۔ اس لیے کہ تانتیا نے مجھ کو اس قدر ہلکان کر دیا تھا کہ کم از کم میں رنادھیر ایسے کردار سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے تانتیا کو منع کر دیا۔

"نہیں بھئی اس کو نہ بھیجنا۔ اب میں بہت تھک گیا ہوں"

وہ میری بات مان گیا" اچھی بات ہے۔" پھر اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا" استاد ایک سگریٹ تو پلاؤ۔ پھر بلا جھجک اس نے میز پر سے سگریٹ اٹھا کر سلگائی۔ خالص فوجی انداز میں سلیوٹ کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اور میز پر ٹانگیں پھیلا کر چھت کو تکنے لگا۔ تانتیا نے مجھ کو اس قدر حواس باختہ کر دیا تھا کہ ایک بار ملک الموت سے مڈبھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ سان و گمان بھی نہ تھا کہ وہ کسی وقت میرے حق میں اس قدر خطرناک

ثابت ہوگا۔ لیکن ابھی ان طمانیت بخش لمحات سے میں بڑے طور پر لطف اندوز بھی نہیں ہو سکا تھا کہ ایکایکی کسی نے دروازے سے گردن نکال کر کہا۔

"قبلہ بندگی عرض ہے۔" ذرا توقف کرنے کے بعد اس نے کہا "حاضر ہو سکتا ہوں۔" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کمرے کے اندر آ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ شاعرانہ انداز میں بکھرے ہوئے بال اور بالکل مادرزاد برہنہ جسم؛ وہ بڑی بے تکلفی سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے مترنّم انداز میں گا کر کہا:۔

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!"

میں نے ڈانٹ کر کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے!"

وہ کہنے لگا "بندہ پرور یہ تو سب آپ کی عنایت ہے۔ غالباً آپ نے مجھ کو پہچانا نہیں۔ خاکسار کو نیازی کہتے ہیں۔ بقول آپ کے "میں پتھر میں آگ" ہوں، شعلۂ بے دُود ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب مزید تعارف کی ضرورت نہیں!" اس کے اس انداز پر مجھ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا "بھئی نیازی صاحب یہ لباس کی قید سے آزاد کرکے آپ کو مجذوب کس نے بنا دیا۔" وہ بڑا مسکین سا چہرہ بنا کر بولا:۔

"ہائے یہی تو رونا ہے، میں تو روزِ ازل سے نیاز مند ہوں۔ مگر یہ آپ

نے بے نیازی کب سے اختیار کر لی۔ یہ تو حسینوں کا شیوہ ہے۔
بہ تغافل کیشی تو ستم بردوں ہی کو راس آتی ہے۔"

میں نے کہا۔"آج تو آپ بڑے اچھے موڈ میں معلوم ہو رہے ہیں۔ خیریت تو ہے۔" کہنے لگا۔"خیریت کہاں، اسی جنسِ نایاب کی تلاش میں تو یہاں تک آیا ہوں۔ آپ نے جب سے کمرے کے اندر مجھ کو بے یار و مددگار چھوڑا ہے۔ اس وقت سے کنجِ عزلت میں پڑا ہوں۔ کسی سے کچھ کہہ سن بھی نہیں سکتا اس لیے کہ پولیس کے کانوں میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو اقدامِ خودکشی میں دھر لیا جاؤں گا۔ بڑی مشکل سے لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا آیا ہوں۔ وہ تو کہیئے کہ رات کا وقت ہے ورنہ کسی راہ گیر کی نظر پڑ جاتی تو پھر تفلیس عامری بن جانے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔ یہاں تو کوئی ایسی لیلے بھی نہیں جو شہر بھر میں یہ منادی کرے۔ ؎

کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو!"

میں نے مسکرا کر کہا۔"دیکھئے نیازی صاحب آپ ٹھہرے شاعر، آشفتہ سر۔ آشفتہ مزاج، چاک گریبان، بال پریشان، ایک ذرا لباس کا تکلف تھا۔ میں نے سوچا۔ کیوں نہ اس خواہ مخواہ کی رخ کو علیحدہ کر دیا جائے میرا خیال ہے کہ آپ اس روپ میں اچھے لگتے ہیں۔" وہ بڑی بے نیازی سے ہنسنے لگا۔"ذرہ نوازی کا شکریہ! گر یہی تمنا ہو تو پھر یونہی سہی! کمرے سے

اندر کچھ عرصہ کے واسطے گہری خاموشی چھا گئی۔ نیازی کچھ سوچتا ہوا نظر آ رہا تھا
آخر میں نے سکوت سے اکتا کر کہا:۔

"کیا کسی مصرعہ پر گرہ لگا رہے ہیں۔ تیور تو کچھ ایسے ہی معلوم ہو رہے ہیں"۔
وہ کہنے لگا۔ "جب سے آپ نے گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے
ذہن بھی کچھ ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا۔ کہ اس وقت کچھ
اظہار کروں۔ یقین مانیئے۔ عجیب کش مکش کا عالم ہے"۔

میں نے کہا۔ "کیا آپ کو بھی مجھ سے کچھ باز پرس کرنا ہے؟"
کہنے لگا۔ "ارادہ تو یہی ہے اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ دراصل
آپ نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے"۔

میں نے بات کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ جلدی سے کہا۔ "بھئی اب تو
میں بہت تھک چکا ہوں۔ کیا مصیبت ہے۔ جس کو دیکھئے وہی احتجاج پر
آمادہ ہے۔ ہر شخص شکایتوں کا دفتر کھولے ہوئے ہے"۔

وہ گڑگڑانے لگا۔ "تو پھر بتائیے ہم اپنی فریاد کس کے پاس لے کر
جائیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ سب سنا کرتے ہیں لیکن نہیں سنتا کوئی!"

میں اس کو منانے لگا۔ "دیکھئے نیازی صاحب۔ آپ تو ماشاءاللہ
شاعر ہیں، ذہین ہیں۔ ہر بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ کم از کم آپ اتنے
بے رحم نہیں ہو سکتے کہ میری پریشانیوں سے بے نیاز ہو جائیں"۔

وہ مسکرا کر بولا "جی! میں تو حضور کا نیاز مند ہوں۔ بہر حال جیسی آپ کی مرضی۔ پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔" میں نے سوچا کہ چلو اس وقت تو مصیبت ٹل جائے۔ آئندہ کی بات آئندہ دیکھی جائے گی۔

نیازی نے جھک کر آداب عرض کیا، پوری عقیدت مندی کے ساتھ اجازت طلب کی۔ پھر ایک بارگی اس نے اپنے برہنہ جسم پر نظر ڈالی اور کمرے میں ادھر ادھر تجسس انگیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایکا ایکی اس نے لپک کر کھڑکی کا پردہ نوچا اور اپنے جسم سے لپیٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"معاف کیجئے گا اس جرأتِ رندانہ کو، دراصل باہر جو امیدوار بیٹھے ہیں ان میں کچھ خواتین بھی ہیں۔ اور ایک تو ان میں فتنۂ مجسّم ہے۔ خدا کی قسم قیامت ہے قیامت۔ اور اپنا حال یہ ہے کہ ساری زندگی مسرت کے گیت گاتے بیت گئی۔ محبتوں کے نغمے الاپ الاپ کر گزر گئی۔ مگر کسی کی جلوہ گاہِ ناز میں رسائی نہ ہوئی۔ کسی کا التفات نصیب نہ ہوا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آپ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ کاش آپ نے مجھ کو شاعر کے بجائے کسی مہ لقا کی کار کا ڈرائیور ہی بنا دیا ہوتا۔ کم از کم حسینوں کا قرب تو حاصل ہو جاتا۔ خوابوں کے سہارے تو نہ جینا پڑتا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس لیے کہ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ شاعر ہوا تو کیا۔ بپھر جاتا تو پھر سنبھالے نہ سنبھلتا۔

چپ رہنے ہی میں خیریت تھی، اس لیے میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا ہوا زیر لب کوئی مصرع گنگناتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اب گلو خلاصی اسی میں ہے کہ میں کہیں چھپ جاؤں۔ چنانچہ میں جلدی سے پلنگ کے نیچے گھسنے لگا۔ اس لیے کہ کمرے میں اور کوئی بھی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں میں روپوش ہو سکوں۔ بہر حال کہیں نہ کہیں تو سر چھپانا ہی تھا۔ لیکن ابھی میرے جسم کا نصف حصہ باہر ہی تھا اور میں اندر جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نے میرے شانے کو زور سے جھنجھوڑ کر کہا:۔

"آپ جا کہاں رہے ہیں ذرا میری بات تو سنتے جائیے!"

میں نے سہمی ہوئی نظروں سے گھوم کر دیکھا۔ میرے قریب چھریرے جسم کی ایک خوب صورت سی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے بدن میں خم ہی خم تھے زاویے ہی زاویے تھے۔ وہ تیر کی طرح سیدھی کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ جسم کا ہر حصہ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ مگر بے حد نرم اور شگفتہ۔ میں اس کو خواب ناک نظروں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بڑے تیکھے لہجہ میں بولی:

"یہ آپ مجھ کو اس طرح گھور کیوں رہے ہیں۔ آخر یہ کیا مصیبت ہے جس کو دیکھئے وہ ایسی نظروں سے دیکھتا ہے کہ جیسے جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس جائے گا۔ اور سب سے زیادہ وبالِ جان تو وہ آپ کا شاعر ہے میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ بے حس کہیں کا ننگ دھڑنگ گھومتا

پھر رہا ہے۔ ذرا بھی اس کو شرم نہیں آتی۔ مجھ کو دیکھتے ہی سینہ پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کر دیں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ تو فلمی ہیرو کی طرح گانے لگا

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔

اس حرکت پر میں ہنسنے لگی تو وہ اور بھی اِترا گیا۔ میرے قریب آکر سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ سے یہ شعر پڑھنے لگا۔ ؎

رخسار پر لطیف سی اک موج سی خوشی

لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے

بتائیے میں کیا کروں۔ خدا کے لیے اس سے میرا پیچھا چھڑوائیے میں تو اس قدر عاجز آگئی ہوں کہ رو پڑوں گی۔"

وہ بے حد تیز و طرار لڑکی تھی۔ مشین کی طرح فر فر سب کچھ کہتی چلی گئی آخر مجھ کو کرسی پر آکر پھر بیٹھنا پڑا۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کو پہچاننے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ وہ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر ایک بار گی نرم و نازک شاخ کی طرح خم کھا کر میرے قریب آگئی۔ اور بڑے ناز سے بولی۔"آپ چپ کیوں ہیں بتائیے میں کیا کروں۔ سچ مچ بڑی پریشان ہو رہی ہوں"۔ میں نے اس کی شکایتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:۔

"لیکن صندلی تم اس وقت رات گئے محل سرا سے کس طرح نکل آئیں؟"

وہ تیزی سے بولی "رانی صاحبہ کے مرنے کے بعد آپ نے تو مجھ کو در بدر کی خاک چھاننے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ایسا فراموش کیا کہ پھر لوٹ کر خبر ہی نہ لی۔"

میں نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "نہیں صندلی! میں نے تم کو فراموش نہیں کیا۔ تم اس قدر بدحواس کیوں ہو گئیں۔ تم تو میرے افسانے کا وہ کردار ہو جس کو تخلیق کرنے کے بعد مجھ کو خود تم سے محبت ہو گئی۔ واقعی صندلی تم بے حد حسین ہو۔ جب تم پوری سج دھج کے ساتھ پہلی بار میرے سامنے آئی تھی۔ تو میں خوشی سے وارفتہ ہو کر چیخ اٹھا تھا کہ اس دفعہ تو میں نے ایمیل زولا کا قلم چرا لیا ہے۔"

وہ کچھ شرماسی گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "یہی تو آپ نے ستم کیا مجھ کو بنانے میں آپ اپنے ساتھ بھی حق تلفی کر بیٹھے۔ آپ نے دنیا کو انگشت نمائی کا موقعہ دے دیا۔ آپ کو خبر ہے کہ آپ کے خلاف کیسی کیسی چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔" میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھ کو سب کچھ معلوم ہے۔ مجھ کو اپنی لغزش کا بھی احساس ہے لیکن میں کیا کروں کہ میں متوسط طبقہ کا ایک فرد ہوں۔ جس میں وٹامن نہ ملنے کے باعث بدصورت لڑکیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جو جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جہاں خوب صورتی جنم لیتی ہے وہاں

میری باریابی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ میں اقتصادی بدحالی کا مارا ہوا ایک پریشان حال افسانہ نگار ہوں۔ لہٰذا میں نے اپنے ذوقِ جمالیات کی آسودگی کے واسطے تم کو تخلیق کیا۔ میں نے اپنے تمام تشنہ ارمانوں کو، اپنی تمام پامال حسرتوں کو تمہارے وجود میں سمو دیا۔ کم از کم مجھ کو یہ کہنے کا حق تو حاصل ہے کہ میں ایک فن کار ہوں۔ اور یہ فطری امر ہے کہ مجھ کو بے حد حساس ہونا چاہیئے۔"

وہ خاموشی سے بیٹھی میری باتیں سنتی رہی۔ پھر واپس جانے کے خیال سے دروازہ کی طرف مڑنے لگی۔ "اچھا تو میں اب جا رہی ہوں۔ ابھی آپ سے ملنے کے لیے اور بھی بہت سے لوگ باہر منتظر کھڑے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا:۔

"خدا کے لیے اس وقت تم میری کچھ مدد کرو۔ اب تو کسی سے ملنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ جس طرح تم نے مرزا کو اپنی ذہانت کے بل بوتے پر کئی گھنٹے تک رانی صاحبہ سے ملنے نہیں دیا تھا۔ اسی طرح اس وقت بھی تم ان سب کو ٹال دو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

وہ کہنے لگی "دیکھئے میں کوشش کرتی ہوں۔ مگر وہ باز نہ آئیں گے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو آپ کے دلاور علی خاں کو رضامند کرنے کا ہے۔ جن کو آپ نے "اجنبی" کے روپ میں پیش کیا ہے۔ وہ بے حد ناراض ہیں اپنے

ابا جان کا بھرا ہوا ریوالور لے کر آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں سارے افسانہ نگاروں کو شوٹ کر دوں گا۔" میں نے بدحواس ہو کر کہا۔

"نہیں صندلی۔ جس طرح بھی بن سکے تم اس کو روکو۔ تم کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اس کو جا کر سمجھاؤ۔ کہیں وہ یہاں چلا نہ آئے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "گھبرائیے نہیں۔ میں سب کو ٹال دوں گی۔ مگر اس وقت تو وہ چلے جائیں گے۔ آئندہ کیا ہو گا؟" واقعی یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی۔ اب تو یہ مستقل آزار ہو گیا تھا۔ مجھ کو پریشان دیکھ کر کہنے لگی۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جلدی سے ایک "پہرے دار" کو تخلیق کر دیجئے جو جہنم کے داروغہ سے بھی زیادہ ہیبت ناک ہو۔ جس کو دیکھ کر سب کی روح فنا ہو جائے۔" ذرا دیر رک کر کہنے لگی۔ "اس وقت تو جا کر میں یہ کہہ دوں گی کہ آپ نے "پولیس کو ٹیلی فون کر دیا ہے۔ جو آتے کے ساتھ ہی لاٹھی چارج شروع کر دے گی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "صندلی خدا کی قسم تم بے حد ذہین ہو۔" اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور مسکراتی ہوئی سائے کی طرح لہرا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے فوراً ہی قلم اٹھایا اور میز پر جھک کر ہیلنو خاں کے بجائے ایک پہرے دار کا کردار تیار کرنے میں منہمک ہو گیا۔

○

# چور دروازہ

تڑاخ سے کوئی چیز فرش پر گری۔ یہ شیشے کے برتن کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ ذرا دیر بعد ایک اور چھناکا ہُوا۔ پھر تو لگاتار چھَن چھَن کرکے شیشے ٹوٹنے لگے فرنیچر ٹوٹنے لگا اور دھما دھم کی آوازیں آنے لگیں۔ شور اوپر کی منزل پر ہو رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو آدمی گتھم گتھا ہو کر بڑے وحشیانہ انداز میں لڑ رہے تھے

جاڑوں کی سنسان رات تھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے بُرا حال تھا۔ میں سہما ہُوا لحاف کے اندر دبکا سکتے کے سے عالم میں خاموش پڑا رہا۔ کئی منٹ بعد رات کے سنّاٹے میں پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ وہ غصے سے چیخ کر کہہ رہا تھا:

"بے ہودہ، بدتمیز نامعقول کہیں کا۔"

"نکل جاؤ یہاں سے"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

پھر لکڑی کے زینے پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ اُبھری۔ دروازہ تیزی سے کھلا اور بند ہو گیا۔ میں اسی طرح خوف زدہ بستر کے اندر لیٹا رہا۔ ذرا دیر بعد میرے کمرے کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

"شہیر، مسٹر شہیر۔"

یہ پروفیسر کی آواز تھی اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے اس وقت اٹھ کر دروازہ کھولنا مناسب نہ سمجھا۔ مست مارے خاموش لیٹا رہا۔ پروفیسر رک رک کر دھیمے لہجہ میں مجھ کو پکارتا رہا۔ آخر اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ شخص تو بڑی خراب نیند سوتا ہے۔" اور بڑبڑاتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی مجھ کو دیر تک نیند نہ آئی۔ بے چینی سے پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔

سویرے جب میں پروفیسر کے پاس گیا تو دیکھا، کمرے کے اندر شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، ان میں ٹوٹے ہوئے گلاس تھے گل دان تھے، تصویروں کے فریم تھے۔ ایک طرف وہسکی کی ایک بوتل

بھی پڑی تھی۔ کمرے کا سارا فرنیچر الٹا پلٹا پڑا تھا۔ سامنے ایک ٹوٹے ہوئے صوفہ پر پروفیسر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اور آنکھیں سوجی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے تمام رات اسی ٹوٹے ہوئے صوفے پر جاگ کر گزاری ہے۔ اسی عالم میں اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کو اس طرح خاموش دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "پروفیسر صاحب خیریت تو ہے۔" بڑی بے زاری سے بولا:۔

"جی ہاں، سب خیریت ہی ہے۔" پھر اس نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ نہیں رہے ہیں، آپ یہ خیریت۔" میں نے اظہارِ تعجب کرتے ہوئے۔ "آخر یہ ہوا کیا؟" وہ اسی طرح تلخ لہجہ میں بولا۔" مجھ سے سوال کرنے کے بجائے تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں کتنا احمق واقع ہوا ہوں۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ آخر وہ خود ہی کہنے لگا۔

"اس دور کا المیہ سب سے بڑا یہ ہے کہ آج انسان بے حد SADIST ہو گیا ہے۔"

اس بات کا بھی کمرے میں بکھرے ہوئے بے ترتیب پڑے ہوئے

ٹوٹے پھوٹے سامان سے بظاہر کوئی تعلق معلوم نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا کچھ کہتے ہوئے مجھ کو جھجک محسوس ہوئی۔ مجھ کو خاموش دیکھ کر وہ بڑے بجھے ہوئے لہجہ میں بولا:۔

"بات صرف اتنی ہے کہ گزشتہ شب، کوئی گیارہ بجے ایاز صاحب تشریف لائے تھے۔ طبیعت میری خراب تھی، اس لیے جلدی سو گیا تھا انھوں نے آکر زبردستی جگایا۔ نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ قدم کہیں پڑ رہے تھے، کہتے کچھ تھے اور زبان سے نکلتا کچھ اور تھا۔ آتے ہی جیب سے بوتل نکالی اور شغلِ بادہ نوشی شروع کر دیا۔ میرے سپرد بیرہ گیری کی خدمت ہوئی۔ اس لیے کہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں رات کے وقت اپنی ضرورت کے لیے بھی کبھی ملازم کی نیند خراب نہیں کرتا۔ لہٰذا جو آرڈر کرتے گئے میں اس کی تعمیل کرتا رہا۔" وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک تفصیل بتا رہا تھا۔ اب نہ اس کے چہرے پر وہ جھنجھلاہٹ تھی اور نہ لہجے میں تلخی۔ البتہ باتوں میں بلا کا طنز تھا۔ "تو صاحب مجھ سے کچھ حکم عدولی ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ آپے سے باہر ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا اندازہ آپ کمرے کے اس حلیہ سے کر سکتے ہیں۔ وہ اودھم مچایا کہ اب آپ سے کیا عرض کروں۔"

میں نے کہا۔ "شور تو کل رات کچھ میں نے بھی سنا تھا۔"

وہ مسکرا کر بولا۔" آپ تو بڑی بے خبر نیند سوتے ہیں، میں نے تو آپ کو آوازیں بھی دیں مگر آپ کی آنکھ نہ کھل سکی۔" وہ اس وقت بڑے تکلف کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

میں خواہ مخواہ پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔" نیند تو واقعی میری بہت خراب ہے میرے سر کے اوپر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا اور میری آنکھ تک نہیں کھلی۔" پھر میں نے اس سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔" زیادتی، ہاں بھئی یہی کہہ لو۔" میں نے سوچا کہ زیادتی کا لفظ استعمال کر کے میں نے پروفیسر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ لہٰذا میں نے اس کا تدارک کرنے کی غرض سے کہا:۔

"معاف کیجئے گا پروفیسر صاحب مجھ کو صحیح طور پر آپ دونوں کے تعلقات کا اندازہ نہیں، مگر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آیا زکا اب یہاں آنا جانا بند کرا دیجئے۔"

وہ تھکے ہوئے لہجہ میں بولا۔" اب یہی میں نے بھی سوچا ہے۔"

میں نے اس سلسلہ میں زیادہ کہنا خلاف مصلحت سمجھا۔ علاوہ ازیں دفتر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں پروفیسر سے رخصت لے کر دفتر کی جانب چل دیا

لیکن راستہ بھر میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ دل ہی دل میں اس کی ضرورت سے زیادہ ملنساہٹ پر کڑھتا بھی رہا۔

میری نئی نئی ملاقات تھی اس کے ساتھ رہتے ہوئے مجھ کو ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں ہوا ہوگا۔ وہ میرے بڑے بھائی کا کلاس فیلو رہ چکا تھا اسی لیے مجھ کو اس کے ذاتی حالات کے متعلق بہت کچھ علم تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے حالات کے خلاف کبھی بغاوت کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ہمیشہ زندگی سے سمجھوتہ قائم رکھا۔ اس سمجھوتہ بازی میں حادثات کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ مشکل سے دس برس کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے بھلے گھر کی بہو بیٹیوں کی طرح اولادوں ہی کو سب کچھ جانا اور انہی کے سہارے پورا رنڈاپا گزار دیا۔ عزیزوں نے عقد ثانی کے لیے بہت اصرار کیا مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ ان کے اس انکار سے خاندان والوں سے کچھ اس قدر بدمزگی بڑھی کہ انہوں نے سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ بات کی اتنی دھنی تھیں کہ برے سے برا وقت دیکھا مگر کسی رشتہ دار کے آگے ہاتھ نہ بڑھایا۔ شوہر نے مرتے وقت اتنا بھی اثاثہ نہ چھوڑا جس سے سال چھ مہینہ کٹ جاتے۔ جہیز میں جو دو چار زیور ملے تھے وہی ان کا سرمایہ تھا۔ جس کو فروخت کر کے انہوں نے کپڑا سینے کی مشین خرید لی۔ اور پاس پڑوس کے رہنے والوں کے کپڑے سی سی کر اپنا اور چار بچوں کا پیٹ پالتی رہیں۔

جس وقت باپ کا انتقال ہُوا وہ اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ بیوہ ماں نے کسی نہ کسی طرح اس کی تعلیم کو جاری رکھا خود اس کو بھی پڑھنے کی لگن تھی۔ دن بھر اسکول میں پڑھتا شام کو ایک جلد ساز کی دکان پر کاغذ کاٹنے کی مشین چلاتا جس سے پڑھائی کی فیس نکل آتی۔ رات کو اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں جلانے کا تیل ختم ہو جاتا تو وہ میونسپلٹی کے لیمپ کی روشنی میں جاکر رات گئے تک پڑھا کرتا۔ دھندلی روشنی میں آنکھوں پر زور دے کر پڑھنے سے بینائی خراب ہو گئی۔ اسی لیے کم سنی ہی میں اس نے موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ اس نے ابتدائی زندگی بڑی تنگ دستی میں بسر کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر برسر روزگار ہُوا تو تین جوان بہنوں کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔

سب سے چھوٹی بہن کی شادی کے فرض سے تین چار سال ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ فارغ ہُوا تھا خود اب تک بیاہ نہیں کیا تھا۔ ماں زندہ ہوتیں تو شاید وہ ازدواجی زندگی میں الجھ جاتا مگر اب کون ایسا تھا جو گھر بسانے کے لئے مجبور کرے۔ بہنیں اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ اور اب اس کی عمر بھی چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ سر کے بال کھچڑی ہو چلے تھے۔ چہرے کے خدوخال بھدے ہو گئے تھے۔ قویٰ مضمحل ہوتے جا رہے تھے۔ زیادہ ذہنی مشقت کرنے کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ سن رسیدہ معلوم ہونے لگا تھا۔

گھر میں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔ دیکھ بھال کے لیے ادھیڑ عمر کا ایک ملازم تھا جو بہرہ بھی تھا اور سجھائی بھی اس کو کم دیتا تھا۔ ان خامیوں کے باوجود وہ کئی سال سے اس کے ساتھ نباہ رہا تھا۔ لیکن عزلت نشینی کی زندگی سے آدمی کا مزاج جس قدر روکھی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے وہ اس میں نام کو نہیں تھا پہلی بار جب میں بھائی جان کا خط لے کر اس کے پاس گیا تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا تھا۔ خط پڑھتے ہی بولا۔ "نہیں بھائی تم کو یہاں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ نیچے کا کمرہ میں خالی کرائے دیتا ہوں۔ آج ہی اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔" چنانچہ میں اسی روز شام کو ہوٹل سے اپنا سامان اٹھوا کر اس کے یہاں آ گیا۔ یوں تو دن بھر میں میری اس سے کئی بار ملاقات ہوتی تھی۔ لیکن بات چیت کرنے کے معاملے میں وہ بڑے بخل سے کام لیتا تھا۔ البتہ ایاز کا ذکر کبھی آ جاتا تو وہ ذرا کھل کر بات کرتا تھا۔

ایاز سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر کی گفت گو سے مجھ کو اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ جن دنوں پروفیسر اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ اسی زمانہ میں ایاز سے اس کی ملاقات ہوئی تھی وہ اس کے پاس کیرکٹر سرٹیفکیٹ لینے آیا تھا۔ کہیں ملازمت کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لیے یہ سرٹیفکیٹ چاہیے تھا۔ ایاز نے اسی سال میٹرک کا

امتحان پاس کیا تھا۔ باپ پر فالج گرا تھا۔ وہ اپاہجوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے بڑے بھائی پر گھر کا سارا بار تھا لہذا وہ آگے تعلیم دلانے کے حق میں نہیں تھا پروفیسر نے اس سے گفتگو کی تو اس کو ذرا ہی دیر میں ایاز کی ذہانت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ اس سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ ملازمت کا خیال ترک کروا کے اس کو تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ خود ایاز کی بھی یہی خواہش تھی چنانچہ بی۔ اے تک اس کی تعلیم کا سارا بار پروفیسر برداشت کرتا رہا۔ اب وہ کسی سرکاری محکمہ میں کسی اچھے عہدہ پر ملازم ہو گیا تھا۔

اس روز شام کو دفتر سے لوٹتے ہی میں سیدھا پروفیسر کے پاس پہنچا اس لیے کہ شام کی چائے ہم دونوں بلا ناغہ ایک ہی ساتھ پیتے تھے! اوپر جا کر میں نے دیکھا کہ میز پر چائے کا سامان رکھا تھا۔ اس دن کچھ خاص اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مگر پروفیسر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے لائبریری کے اندر جا کر دیکھا، وہاں بھی اس کا پتہ نہیں تھا۔ اب تو مجھ کو تشویش ہوئی۔ اس لیے کہ وہ عام طور پر اپنا زیادہ وقت اس مختصر سی ذاتی لائبریری میں گزارتا تھا۔

لائبریری سے نکلتے ہوئے اچانک میری نظر برابر والے کمرے کی جانب اٹھ گئی۔ پروفیسر قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا تو حیرت سے چونک پڑا۔ اس وقت وہ شوخ رنگ کی بش شرٹ پہنے

ہوئے بڑے بے ڈھنگے پن سے مسکرا رہا تھا۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ پروفیسر کے ایسا زاہد خشک، لڑکیوں کے پیچھے سڑکوں پر سیٹیاں بجانے والے آوارہ گرد لڑکوں کی سی کبھی وضع قطع اختیار کر سکتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا یہ اپنا پروفیسر تو بڑا چھپا رستم نکلا۔ میں نے اس وقت کمرے کے اندر جانا مناسب نہ سمجھا تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔ اسی وقت پروفیسر نے ٹوک کر کہا:۔

"ارے بھئی شہیر! تم آ گئے، کہاں چلے ادھر آؤ۔"

غالباً اس نے آئینہ میں میرا عکس دیکھ لیا تھا۔ مجبوراً مجھ کو اس کے پاس جانا پڑا۔ اس کی بش شرٹ کو میں نے قریب سے دیکھا تو بڑی ہنسی معلوم ہوئی۔ اس پر جگہ جگہ خبروں کے تراشے تھے کہیں ساحل سمندر پر کوئی دوشیزہ ریت پر لیٹی اپنی ننگی ٹانگوں کی نمائش کر رہی تھی، کہیں کوئی نوجوان جوڑا بڑے شہوت انگیز انداز میں بوس و کنار میں محو تھا۔ اس بش شرٹ کو پہن کر وہ اچھا خاصہ بانکا نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر میری نظروں کو بھانپ گیا تھا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر کہنے لگا۔ "وہ بے غیرت آج پھر آیا تھا۔" یہ ایاز کی جانب اشارہ تھا۔ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ رات کے واقعہ پر پروفیسر نے ایاز کو

معاف کر دیا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون؟"

اس دفعہ وہ کسی قدر بے تکلفی سے بولا۔ "وہی نامعقول ایاز کا بچہ اور کون ابھی ذرا ہی دیر پہلے تو یہاں سے گیا ہے" اس کی اس بات پر میں جل کر رہ گیا۔ عجیب سادہ لوح آدمی ہے۔ کل رات جس شخص نے اس کو اس قدر پریشان کیا۔ آج وہ اس کا اس طرح تذکرہ کر رہا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پروفیسر مجھ کو خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ سارا اللّم غلّم سامان خرید کر وہی لایا ہے"

میں نے دیکھا کمرے میں ایک طرف کئی شوخ رنگ کی ٹائیاں اور رومال، سینٹ کی شیشیاں اور کئی اسی طرح کی بش شرٹیں پڑی تھیں جو اس وقت پروفیسر پہنے ہوئے تھا۔ سامان دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اس پر سو سوا سو روپے ضرور خرچ ہوئے ہوں گے۔ اگر پروفیسر کو منانے کے لیے ایاز اتنی رقم خرچ کر سکتا ہے۔ تب تو پروفیسر کا اس طرح من جانا بیجا نہیں تھا۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ایاز کو آپ کے ٹیسٹ کا بخوبی اندازہ ہے"

وہ شرمندہ ہو کر ہنس دیا۔ "یہ نئی بات نہیں وہ اکثر ایسی حرکتیں کیا کرتا ہے۔ ایک تو یہ فضول سامان اٹھا لیا۔ اس پر یہ اصرار کہ اس کو پہنو بھی میرے

سر ہو گیا۔ زبردستی یہ بش شرٹ پہنوا کر گیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ بش شرٹ مجھ پر کیا اچھی لگے گی؟" میں نے ان کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ اس بیزاری میں بھی کہیں ان کے دل کا چور چھپا ہوا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں پروفیسر صاحب، سچ مچ یہ تو آپ پر کھل رہی ہے۔ بڑے اسمارٹ نظر آ رہے ہیں۔"

جھوٹ موٹ کی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا "اب تم مجھ کو بیوقوف بنانے کی تو کوشش کرو نہیں" میں اس کی بات کا جواب دینے ہی والا تھا کہ اسی اثنا میں دروازہ پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ایاز آیا ہے۔ پروفیسر گھبرا کر بولا:-

"دیکھو وہ میری اسٹوڈنٹ عذرا آئی ہو گی۔ تم جا کر اس کو بٹھاؤ میں ابھی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

میں نے دروازہ پہ جا کر دیکھا، سانولے رنگ کی ایک شرمیلی سی لڑکی وہاں کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا "آپ اندر آ جائیے۔ پروفیسر صاحب ابھی آتے ہیں۔" میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اندر جا کر چپ چاپ صوفہ پر بیٹھ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد پروفیسر بھی وہاں آ گیا۔ وہ کاؤ بوائز والی بش شرٹ دوسرے کمرے میں اتار آیا تھا۔

میں نے غور کیا کہ سانولے رنگ کی شرمیلی لڑکی عذرا میرے سامنے

پروفیسر سے بات کرتے ہوئے کچھ جھجک سی رہی تھی۔ لہٰذا میں نے جلدی جلدی چائے کی پیالی ختم کی۔ اور وہاں سے اٹھ کر نیچے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ذرا دیر بعد پروفیسر میرے کمرے میں گھبرایا ہوا آیا۔ "آج تم باہر گھومنے نہیں گئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے"۔ اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ باہر چلا گیا۔ لمحہ بھر بعد وہ پھر کمرے میں آ گیا۔ آتے ہی وہی سوال کیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا"۔ اور اسی طرح گھبرایا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لکڑی کے زینہ پر اس کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ ایک بار وہ پھر کمرے کے دروازے پہ کھڑا تھا۔ لیکن اب کی بار اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ ڈھونڈنے کے سے انداز میں نظریں گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی اس گھبراہٹ نے مجھ کو بھی خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ میں ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ اس وقت اس سے بات کرنا مناسب بھی ہوگا کہ نہیں۔ پھر وہ خود ہی بولا۔

"تم سے ایک کام تھا"۔

میں نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔ "کہیئے!"

مگر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر سر کے بالوں کو کریدتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس اس وقت ۸ روپے تو نہیں ہوں گے"۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "جی ہاں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں"۔ میں نے اسی وقت روپے نکالے

اور اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ روپے لے کر وہ کہنے لگا۔

"پہلی تاریخ کو تم مجھ سے لے لینا۔ اس وقت کچھ ایسی ہی ضرورت پیش آ گئی تھی۔"

مجھ کو اس نے بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے تو اس نے اپنا جملہ پورا کیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے زینے پر چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ پروفیسر اتنا گھبرایا ہوا کیوں تھا کئی اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں اسی دوران میں پروفیسر اس لڑکی کے ساتھ ساتھ نیچے آیا۔ وہ تو باہر چلی گئی البتہ وہ میرے پاس آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر وہ گھبراہٹ نہ تھی۔ بلکہ وہ کسی قدر بشاش نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بھئی تم نے اس وقت بہت بڑا کام کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں۔"

وہ کہنے لگا۔ "بھئی اس لڑکی کی ابھی تک فیس جمع نہیں ہو سکی۔ فائنل اِئر ہے۔ بے چاری بے حد پریشان تھی۔ اور اپنا حال یہ ہے کہ اس مہینہ ایاز نے کچھ قرض لے لیا تھا اس لیے اپنی جیبیں بالکل خالی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس طرح اس کی فیس کے لیے روپیہ فراہم کروں مگر تم نے ـــ"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"دیکھئے پروفیسر آپ مجھ کو بار بار شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"

وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

لیکن دوسرے ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں ہی مجھ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ عذرا کے علاوہ اور بھی کئی طالب علم تھے۔ جن کی وہ "وقتاً فوقتاً" امداد کیا کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ کا ایک حصہ اسی مد میں چلا جاتا تھا اس کا ذاتی خرچ زیادہ نہیں تھا۔ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کو صرف ایک ہی شوق تھا۔ اور وہ تھیں کتابیں۔ ہر مہینہ وہ کچھ کتابیں خرید کر ضرور لاتا۔ اس طرح اس نے بڑی اچھی لائبریری بنا لی تھی۔ زیادہ تر وہ اسی کے اندر بیٹھ کر اپنا وقت گزارتا تھا۔

اتوار کا دن تھا، پروفیسر نے صبح ہی صبح الماریوں سے کتابیں نکال کر فرش پر جگہ جگہ انبار لگا دیئے تھے اور ان کو نئے ڈھنگ سے آراستہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کام میں وہ اس قدر مصروف تھا کہ اس روز اس نے چائے بھی وہیں پی۔

دوپہر کو میں اس کے پاس گیا۔ مگر وہ کتابوں کی ترتیب میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے دھول سے اٹے ہوئے تھے اس وضع قطع میں وہ بڑا ہونق سا نظر آ رہا تھا۔ مگر اس کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ مجھ کو دیکھ کر اس نے کچھ بات کرنا چاہی۔ مگر اسی وقت ایک بوسیدہ

سی کتاب پر اس کی نظر پڑ گئی وہ اس کو اٹھا کر ورق الٹنے پلٹنے لگا ایک جگہ حاشیہ پر کوئی عبارت درج تھی۔ وہ اس کو نگاہیں گاڑ گاڑ کے دیکھنے لگا۔ اور پڑھنے میں کچھ ایسا محو ہو گیا کہ میری موجودگی کا احساس ہی اس کے ذہن سے نکل گیا۔ میں کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ مگر اس نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ میں اپنی موجودگی کو مداخلت بے جا سمجھتے ہوئے کمرے میں واپس آ گیا اور بستر پر لیٹ کر سو رہا۔

شام سے کچھ دیر پہلے میں پھر اس کے پاس آ گیا۔ اس وقت وہ ساری کتابیں قرینے سے آراستہ کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ بلاشبہ اس نے کتابوں کی ترتیب میں بڑی نفاست سے کام لیا تھا۔ دن بھر کام کرتے کرتے اب وہ بے حد تھک چکا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ذرا دیر اس سے بات چیت کروں گا۔ مگر اس دفعہ بھی اس کو موقع نہ مل سکا۔ کوئی پروگرام نہ تھا۔ اس لیے میں وہاں سے اٹھ کر سینما چل دیا۔

پہلے شو میں بڑا رش تھا۔ اس لیے ٹکٹ نہیں مل سکا۔ لیکن سینما دیکھنے کا اس روز چونکہ پروگرام بنا چکا تھا لہٰذا دوسرا شو دیکھا اور رات کو کوئی بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا۔ اوپر کی منزل میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی پروفیسر ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ روشنی لائبریری میں ہو رہی

تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔ مگر دروازہ پر پہنچ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

سامنے فرش پر ہر طرف کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض کتابیں پھٹ گئی تھیں، ان کے اوراق بکھرے پڑے تھے، الماریاں گر گئی تھیں، ان کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ لائبریری کے مختصر سے آتش دان میں ابھی تک کئی کتابیں جل رہی تھیں، کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو شعلے بھڑک اٹھتے

میں وحشت ناک نظروں سے یہ سب کچھ کھڑا دیکھتا رہا۔

ایک گری ہوئی الماری سے ٹیک لگائے، بکھری ہوئی کتابوں کے درمیان، پروفیسر فرش پر گم سم بیٹھا تھا۔ لحظہ بھر کو میری نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں اس بلا کا کرب تھا کہ میں تاب نہ لا سکا۔ خود بخود میری نگاہیں جھک گئیں۔

کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر کمرے کے گہرے سکوت میں پروفیسر کی آواز ابھری۔

"کب آئے تم؟" اس کے لہجہ میں سسکیوں کا سا درد تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس وقت وہ بہت بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ مجھ کو خاموش دیکھ کر اس نے پھر کہا:۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے" وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں ان کو پھر درست کر لوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ آپ کو سوجھی کیا؟ کتنی تن دہی سے تو آپ نے لائبریری کو آج دن بھر آراستہ کیا تھا۔" میری بات پر وہ ذرا کھل کر مسکرا دیا۔ پھر اس نے بڑا بے تکا سا سوال کیا۔

"تمہارا نام شہیر احمد ہے نا؟"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

اس کا دوسرا سوال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پوچھنے لگا۔ "تم واکرانیڈ واکر میں سپروائزر بھی ہو۔" میں نے اس دفعہ بھی اس کی بات کا صحیح مفہوم سمجھے بغیر کہہ دیا۔ "جی ہاں!"

"اور اس وقت تم میری لائبریری میں کھڑے ہو۔" پھر وہی بے تکا سوال۔ میں نے رٹے ہوئے سبق کی طرح پھر "جی ہاں" کہہ دیا۔ لیکن اس کے کسی اور بے تکے سوال سے قبل ہی میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "ان سوالوں سے آخر آپ کا مطلب کیا ہے؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ اور جب میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ تو پھر لائبریری کا یہ حلیہ میں کیسے بنا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور آتش دان میں سلگتی ہوئی

ایک کتاب کو دیکھنے لگا جس کے جلد چیخ کر دو حصوں میں پھیل گئی تھی کمرے کے اندر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آتش دان میں انگارے دہکتے رہے دریچے سے کبھی کبھار ہوا کا کوئی تیز جھونکا آ جاتا تو شعلے بھڑک اٹھتے اور فرش پر بکھرے ہوئے اوراق کھڑکھڑانے لگتے۔ ایک بار پھر اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اسی عالم میں وہ کہنے لگا۔

"تم اس سارے ہنگامے کی وجہ جاننے کے لیے بڑے بے چین معلوم ہو رہے ہو۔ بھئی بات صرف اتنی تھی کہ شام کو تمہارے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عذرا آ گئی تھی۔ اس کو دو کتابوں کی تلاش تھی۔ اتفاق سے دونوں ہی کتابیں میرے پاس نکل آئیں۔ میں اس سے ان کتابوں کے موضوع پر بات کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں ایاز آ گیا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کو بھی وہیں بٹھا لیا۔ مگر وہ بدھا ہوا منہ پھلائے خاموش بیٹھا رہا۔ میں اس کی ناراضگی کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ اس اتوار کو اس نے پک نک کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھ کو بڑے اصرار سے بلا گیا تھا۔ لیکن میں کتابوں کی ترتیب میں ایسا پھنسا کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ لہٰذا میں نے عذرا کی موجودگی ہی میں معذرت کرتے ہوئے اس کو ساری بات بتا دی تھی۔ اس نے میری باتوں کو خاموشی سے سنا۔ کسی قسم کا اظہارِ خیال نہیں کیا۔

بت کی طرح چپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد اٹھ کر لائبریری میں چلا گیا اور یہاں آکر اس نے جو کچھ کیا وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔"

میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے دریافت کیا۔"آپ نے کوئی مزاحمت نہیں کی؟"

وہ کہنے لگا:"اگر میں اس کو روکتا نہیں تو شاید آج اس نے ساری لائبریری ہی پھونک دی ہوتی وہ ہوا یہ کہ اس کے لائبریری میں جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے کتابیں گرنے کی آواز سنی تھی۔ لیکن جب ایک الماری شور مچاتی ہوئی فرش پر آ گئی تو میں گھبرا کر وہاں پہنچا مگر دروازہ اندر سے بند تھا، اور لائبریری سے کتابوں کے پھٹنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں الماریاں دھڑا دھڑ گر رہی تھیں، شیشے ٹوٹ رہے تھے۔ اس وقت تک عذرا بھی میرے ساتھ ہی تھی بلکہ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ وینٹیلیٹر کے راستے اندر جانے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اندر پہنچا یہ دیکھو گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی، بازو الگ چھل گیا۔" وہ مجھ کو اپنی پھٹی ہوئی پتلون اور زخمی بازو دکھانے لگا۔ میں نے اس کی تکلیف سے متاثر ہوئے بغیر جل کر پوچھا۔

"آخر اتنی سی بات پر ایاز اس قدر دیوانہ کیوں بن گیا۔"

وہ بڑے نرم لہجہ میں بولا۔"تم اس سے ملے نہیں، وہ بڑا سرپھرا نوجوان

ہے۔ اس لائبریری سے تو اس کو ہمیشہ سے بیر ہے۔ وہ تو اس کو قبرستان کہا کرتا ہے۔ اس کا تو قول ہے کہ کتابیں انسانی فکر کی قبریں ہیں۔ زندگی کتابوں سے بھرے ہوئے اس بند کمرے میں نہیں ہے۔ زندگی کوچہ و بازار میں ہے، شراب خانوں اور رقص گاہوں میں ہے۔ اپنی اس بات کو منوانے کے لئے وہ اکثر مجھ سے الجھ پڑتا ہے۔ آج جو اس نے پروگرام بنایا تھا۔ اس میں کچھ بے فکرے نوجوان اور خلرٹ ٹائپ کی تیز طرار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ تمام دن ساحل سمندر پر بیئر پی کر گانے ناچنے، پانی میں اچھل کود کرنے اور ایسے ہی ہنگامہ برپا کرنے کا پروگرام تھا۔ اب تم ہی بتاؤ میں ان لوگوں کے ساتھ اس ادھم دھاڑ میں کیا اچھا معلوم ہوتا۔ میں نے اس کو سمجھایا بھی مگر وہ برابر یہی کہتا رہا کہ تم خواہ مخواہ اپنے کو بوڑھا سمجھنے لگے ہو۔ میں نے تو ساٹھ ساٹھ سال کے معمر انگریزوں کو ایسے موقعوں پر عام طور سے دیکھا ہے۔"

وہ اپنی بات کہہ چکے تو میں غور کرنے لگا کہ تمام برائیوں کے باوجود ایک بات ضرور ہے۔ وہ یہ کہ ایاز واقعی پروفیسر سے بڑا خلوص رکھتا ہے۔ اس نے یہ جو کچھ کیا۔ وہ صرف اس کی ہمدردی میں کیا تھا۔ یہ بات دوسری ہے۔ کہ کبھی کبھی ہمدردی بڑی مہنگی بھی پڑ جاتی ہے۔ ایاز کی جانب سے مجھ کو جو غصہ تھا وہ اب کم ہو چکا تھا۔ لیکن پروفیسر نے اس کو ابھی تک معاف نہیں کیا تھا۔ اس بات کا اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ ایک پھٹی ہوئی

کتاب کے ورق سمیٹتے ہوئے اس نے بڑے طیش کے عالم میں کہا تھا۔
"شبیر میں نے یہ کتاب ۱۵ سال پہلے خریدی تھی، اس الو کے پٹھے نے اس کو پھاڑ توڑ ڈالا۔ مگر اس کو کیا خبر کہ اس کتاب کو خریدنے کے لیے میں نے اپنے ایک دوست کی گھڑی چرائی تھی۔ اور رات بھر حوالات میں رہنا پڑا تھا۔" وہ بڑا جذباتی ہوتا جا رہا تھا۔ "کسی کو کیا خبر کہ ان کتابوں کے ساتھ میری زندگی کی کتنی دردناک یادیں وابستہ ہیں۔"

دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بڑی مشکل سے میں نے اس کو وہاں سے اٹھا کر بستر پر پہنچایا۔ ورنہ وہ ساری رات وہیں گزار دیتا پتہ نہیں، میرے واپس آنے کے بعد وہ پھر وہاں پہنچ گیا ہو۔

اس واقعہ کو اب ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ پروفیسر سے اکثر ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں مگر اس نے بھول کر بھی ایاز کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں نے ایک بار چھیڑ کر ایاز کے متعلق پوچھا بھی تو وہ نظر انداز کر گیا۔ میں نے گھما پھرا کر پھر اس کے ذکر کو لانا چاہا تو میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور چہرہ تمتما اٹھا۔ اس دفعہ ایاز نے واقعی اس کو بہت سخت صدمہ پہنچایا تھا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز رات کے وقت پروفیسر خلاف معمول دیر سے واپس آیا۔ میرے کمرے کے اندر آ کر کہنے لگا "بھئی معاف

کرنا۔ میں نے تم کو ڈسٹرب تو نہیں کیا"۔ اس قسم کے تکلفات وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے پر تازگی تھی اور لہجے میں ایک خاص طرح کی تیزی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"ہرگز نہیں، مگر آج آپ کو اتنی دیر کہاں ہو گئی"۔

وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ "ارے بھائی، کچھ پوچھو نہیں، اس نامعقول سے راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ نہ جانے کہاں سے بڑی شان دار کار لے آیا تھا۔ ساتھ میں لڑکیوں کی پوری پلٹن تھی۔ کم بخت ان میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی سب کو چھوڑ چھاڑ میرے پاس آ گیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ میری عزت اب بھی اسی طرح کرتا ہے۔ ذرا دیر تک تو ہم دونوں چہل قدمی کرتے رہے۔ پھر وہ مجھ کو اپنے ساتھ زبردستی کلب لے گیا۔ بھئی پوکر تو وہ کمال کا کھیلتا ہے۔ یہ مجھ کو آج پتہ چلا۔ ذہین اس بلا کا ہے کہ آج تو سارے لوگ دنگ رہ گئے۔ ایسا ہوا کہ ایک بھاری بھرکم جسم کا آدمی خوب جیت رہا تھا۔ کارڈ اس کو بڑا فیور کر رہا تھا۔ ایک بار کارڈ ڈیل ہونے سے پہلے ایاز کو ایکا ایکی جانے کیا سوجھی کہ کھڑے ہو کر تاشوں کی گڈی اپنے ہاتھ میں لی۔ اس بیچ سے چار تاش نکال کر جیب میں ڈال لئے اور بازیگروں کی طرح لوگوں سے کہنے لگا۔ دیکھئے ابھی میں اپنے جادو منتر کے زور سے یہ کارڈ آپ کی جیب سے نکالتا ہوں، اور اس نے اس بھاری بھرکم

جسم والے آدمی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاروں کارڈ نکال کر دکھا دیئے آج تک کسی نے شاہ پرکو اس طرح نہ پکڑا ہوگا۔ وہ اس بات پر بگڑا تو ایاز نے اس کی ٹائی پکڑ کر وہ مکا مارا کہ کرسی سمیت فرش پر آ رہا۔ پھر تو سب ہی اس پر لوٹ پڑے۔ وہ مرمت ہوئی کہ بس کچھ پوچھو نہیں۔" شاید ان کی نظروں میں وہ پورا منظر آ گیا تھا۔ وہ برابر ہنسے جا رہے تھے۔ میں نے اس کو اس فراخ دلی سے ہنستے بہت کم دیکھا تھا۔

رات اب زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ تھوڑی دیر بعد اوپر چلا گیا۔ اب پھر ایاز کا ذکر شروع ہو گیا تھا۔ کوئی بات ہوتی۔ کسی کا تذکرہ ہوتا۔ وہ خواہ مخواہ گفتگو میں ایاز کو ضرور لے آتا۔ اکثر تو مجھ کو اس کے اس انداز پر جھنجھلاہٹ سی معلوم ہوتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنا نیا سوٹ پہن کر کہیں جا رہا تھا کہ دروازہ پر پروفیسر مل گیا۔ کہنے لگا۔

"سوٹ تو تم نے بڑا شاندار سلوایا ہے۔ کپڑا بھی قیمتی معلوم ہوتا ہے" پھر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے بولا "لیکن کمر کے پاس کچھ جھول آ گیا ہے اس عیب نے وقعت گھٹا دی۔ اسی کپڑے کا میں نے ایاز کے پاس بھی ایک سوٹ دیکھا ہے۔ نہ جانے کس درزی سے سلوایا ہے، بڑی عمدہ فٹنگ ہے! اس کا جسم بھی خوب صورت ہے۔ پہن کر چلتا ہے تو بالکل رابرٹ ٹیلر معلوم ہوتا ہے۔"

ایاز میں لاکھ خوبیاں سہی مگر اس وقت اس کے ذکر کا موقع نہیں تھا۔ اسی طرح ایک روز میں بڑا نفیس سا سینٹ لے کر آیا۔ اس کی مہک کی دیر تک تعریف کرتا رہا۔ پھر نہ جانے ایک بارگی اس کو کیسے ایاز کا خیال آگیا۔ کہنے لگا" لیکن ایاز کے پاس جو میں نے سینٹ دیکھے ہیں۔ ان کی مہک سے روح پر وجد طاری ہو جاتا۔ خوشبوؤں کے انتخاب میں اس نے بڑا نفاست پسند ٹیسٹ پایا ہے" اس دفعہ بھی میں غصہ پی گیا البتہ اس روز تو میں ان کے بیمار سے بے حد جھلا گیا تھا۔ جب انہوں نے خواہ مخواہ ایاز کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ والدہ نے خط کے ساتھ ایک لڑکی کی تصویر بھیجی تھی۔ اس کے ساتھ وہ میری نسبت طے کر رہی تھیں۔ وہ لڑکی صورت شکل کی جیسی بھی ہو مگر فوٹو اس قدر غضب کا تھا کہ دیکھ کر آدمی خود تصویر بن جاتا تھا۔ شامتِ اعمال میں نے وہ تصویر پرفیسر کو بھی دکھا دی۔ ذرا دیر تک وہ اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا:۔

"بہت خوب۔" ذرا دیر وہ اس کو محویت کے ساتھ دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔" تمہارے لیے اس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ بڑی حسین لڑکی ہے کہیں ایاز کے ساتھ اس کا رشتہ ہو جائے تو دونوں کا مثالی جوڑا ہو جائے" کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ گیا۔ جہاں دیدہ آدمی تھا۔ فوراً ہی اس کو غلطی کا احساس ہوا۔ گھبرا کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں اس وقت واقعی غیظ کے عالم میں

تھا معذرت کرنے کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"بھئی برا نہ ماننا، میں نے تو یوں ہی یہ بات کہہ دی تھی"۔ اس کے بعد وہ اس لڑکی کے حسن کی تعریف دیر تک کرتا رہا۔ مگر اس کی بات میرے دل میں ایسی لگی کہ ان باتوں سے اس کا اثر زائل نہ ہوا۔ غصہ تو اب کم ہو گیا تھا۔ البتہ میں اس وقت بے حد اداس ہو گیا تھا۔ مجھ کو پریشان دیکھ کر کہنے لگا۔

"تم واقعی برا مان گئے۔ بڑے جذباتی ہو اچھا آؤ۔ میں تم کو بڑی دلچسپ چیز دکھاؤں"

میرا اس کے ساتھ جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ مجھ کو اصرار کر کے اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔ پھر اس نے اپنے سرہانے دیوار پر لگے ہوئے ایک مجسمہ کو دکھایا نہ جانے وہ کس پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ وہ دیوار گیری کی طرح دیوار پر آویزاں تھا۔ مجسمہ میں سے سبزی مائل نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ ایک عورت کا مجسمہ تھا۔ وہ رقص کے انداز میں کھڑی تھی، کچھ اس طرح کہ اس میں جھجک بھی تھی اور خود سپردگی بھی۔ اس کے بدن کا ایک ایک خم، ایک ایک لوچ نکھر گیا تھا۔ سنگ تراش نے اس فٹ بھر کے مجسمہ میں صناعی کا کمال دکھا دیا تھا۔ میں دیر تک اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پروفیسر مجھ کو اس عالم میں دیکھ کر مسکرا دیا۔

"تم تو اس سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ یہ میرے ایک دوست ابھی چنیلرکی

روز ہوئے روم سے لائے تھے۔ بھئی اطالوی سنگ تراشی کی کیا بات ہے
میں نے اب تک تم کو اس لیے نہیں دکھایا تھا کہ تم اس کو میرے کمرے
میں دیکھ کر نہ جانے کیا سوچو گے۔"

نہ جانے کیوں اس کو اپنے بوڑھے ہونے کا اس قدر احساس تھا
بہر حال ہم دونوں کوئی گھنٹہ بھر تک صرف اس مجسّمہ کے موضوع پر باتیں کرتے
رہے۔ سنگ تراشی پر بات چلی تو اس نے اس فن پر اس انداز سے گفت گو
کی کہ اس کے مطالعے پر میں ششدر رہ گیا۔

لیکن اس کی فطرت کا نہ جانے یہ کون سا پہلو تھا کہ جب اس کا موڈ
ہوتا تو کسی بھی موضوع پر بے تکان باتیں کرتا رہا۔ ورنہ کوئی سوال بھی پوچھا
جاتا تو اس طرح خاموش بیٹھا رہتا کہ جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ یہی بات اس
مجسمہ کے سلسلے میں بھی ہوئی۔ دوسرے دن میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ چند
جملے کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس مجسمہ سے میں اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے
پھیر پھر کر پھر اس کا ذکر نکالا۔ وہ اس کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے
اصرار کیا تو جھنجھلا کر میرے پاس سے اٹھ کر لائبریری میں چلا گیا۔ جب کبھی
وہ کسی ذہنی پریشانی میں ہوتا تھا تو ہمیشہ لائبریری میں جا کر پناہ لیتا تھا۔

دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے میں رات کو دیر سے لوٹا۔ کچھ
ایسا اتفاق ہوا تھا کہ دن بھر میں پروفیسر سے نہیں مل سکا تھا۔ اوپر کی منزل

میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ابھی نیند تو آئے گی نہیں، ذرا دیر پروفیسر ہی کے ساتھ وقت گزر جائے تو اچھا ہے۔ کچھ بھی سوچ کر میں اس کے کمرے میں گیا۔ وہ بجائے صوفہ کے گل دان رکھنے کے اونچے سے اسٹول پر بندر کی طرح سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے ماتھے پر سے خون بہہ کر رخسار پر آ کر جم گیا تھا۔ بدن پر اور بھی کئی جگہ خراشیں تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج پھر یہاں کچھ نہ کچھ ہنگامہ برپا ہوا ہے۔

وہ کچھ اس طرح بت بنا بیٹھا تھا کہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ ایک دفعہ اس نے مجھ کو دیکھا بھی۔ مگر چپ بیٹھا رہا۔ میں بھی خاموش کھڑا رہا۔ آخر اس نے خود ہی کہا۔

"کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔"

پروفیسر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ کھوئی کھوئی نظروں سے مجھ کو دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ اسٹول پر سے اتر کر نیچے آ گیا۔ پھر اس نے مجھ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھ کو لیے ہوئے خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے مجسمہ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

"آیا تھا؟" پھر میں نے جلدی سے پوچھا"کیا وہ آیا تھا؟"

"ہاں" اس نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔

میں نے غصہ سے تقریباً چیخ کر کہا "آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"وہ کہتا ہے کہ جو لوگ پتھر کے مجسموں میں اپنی تسکین کا سامان ڈھونڈتے ہیں، وہ پتھر کی طرح سرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ موت کی علامت ہے۔ وہ مجھ کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے اس نے مجسمہ توڑ دیا۔ میں نے اس کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو وہ وحشیوں کی طرح مجھ سے الجھ گیا۔ بالکل پاگلوں کی طرح حرکتیں کر رہا تھا۔"

وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔ مجھ کو اس کا یہ انداز بے حد ناگوار گزرا۔ میں نے جل کر کہا "اس الو کے پٹھے کو آپ نے خواہ مخواہ سر چڑھا لیا ہے۔"

میری بات پر برا ماننے کے بجائے وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا "تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔" وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ ایکا ایکی اس کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کو دلاسہ دے کر چپ کرا دوں۔ مگر اس وقت اس کا رو لینا ہی اس کے حق میں مناسب تھا۔ وہ دکھ جو بہت دیر

سے وہ اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا۔ وہ آنسوؤں کے ذریعہ تحلیل ہو کر نکل رہا تھا۔ کمرے کے گہرے سکوت میں اس کی سسکیاں دیر تک ابھرتی رہیں۔ سامنے فرش پر اس مجسمہ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جس کے وجود میں ایک حسینہ کے جسم کا لوچ تھا، پیچ و خم تھے۔ جو اطالوی سنگتراشی کا ایک نادر نمونہ تھا۔ پروفیسر کا چہرہ مردے کی طرح خاکستری ہو گیا تھا۔ اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اسی اثنا میں پروفیسر پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا اور بوڑھوں کی طرح کھانسنے لگا۔

کھانسی سے وہ جب ذرا سنبھلا تو مجھ سے کہنے لگا "تم اس وقت مجھ کو تنہا چھوڑ دو، میں تمہارا بہت ممنون ہوں گا۔" یہ بات اس نے کچھ اس لہجہ میں کہی تھی کہ میرے لیے اب وہاں ٹھہرنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔

میں چپ چاپ نیچے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر بے چینی میں نیند نہ آسکی۔ اوپر پروفیسر کے کمرے سے اب تک کھانسی کی آواز آ رہی تھی۔ جب تک میں جاگتا رہا کھانسی کی آواز برابر آتی رہی۔ پتہ نہیں وہ رات میں کسی لمحہ سویا بھی یا ساری رات آنکھوں میں ہی کاٹ دی۔

اب تک میں نے ایاز کا اس قدر بے چینی سے انتظار نہیں کیا تھا۔ مگر اس رات کے واقعہ کے بعد سے تو بس ہر وقت یہی دھن تھی کہ کسی طرح وہ مل جائے تو اس کو دھکے دے کر اس قدر ذلیل کر کے نکالوں کہ وہ دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کرے۔ اسی ارادے کے تحت میں نے دفتر سے ہفتہ بھر کی چھٹی لے لی۔ اور گھر سے نکلنا بھی بند کر دیا۔ ہر وقت بیٹھا بس ایاز کی ہی راہ تکتا رہا۔ لیکن وہ بھول کر بھی اس طرف نہ آیا۔ پروفیسر کو تو یہ بات نہیں بتائی مگر اس کی اتنی طویل غیر حاضری سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس روز رات کو دونوں میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔

پروفیسر سے بھی ان دنوں کم ملاقات ہوتی تھی۔ اس کا بوڑھا ملازم اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ٹائی فائڈ بتایا تھا۔ پروفیسر خود ہی اس کو دوا پلاتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کے لیے دودھ گرم کرتا چونکہ دوائیوں کا آج کل قحط ہے دن بھر اس کے لیے دوائیاں ڈھونڈتا پھرتا۔ رات کو سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دباتا۔ نیند سے اٹھ اٹھ کر اس کو پانی پلاتا۔ لیکن ملازم کی بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ لہذا ڈاکٹروں کے مشورے پر وہ اس کو اسپتال لے گیا۔ لیکن روزانہ سہ پہر کو بلاناغہ اس کے پاس جاتا۔ کوئی مہینہ بھر بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔

جس روز وہ ملازم کو اسپتال سے مکان پر لے کر آیا۔ اس روز اس

کے چہرے پر بڑی اچھوتی چمک تھی۔ ایسی تازگی جو شبنم سے بھیگ کر پتوں پر آجاتی ہے۔ بوڑھا ملازم تو اب صحت یاب ہو گیا تھا۔ مگر اس کی بیماری پر نہ صرف ہم دونوں کی مہینہ بھر کی تنخواہیں صرف ہو گئی تھیں، بلکہ کچھ قرض بھی چڑھ گیا تھا۔ اور یہ قرض خواہ اکثر آکر پریشان کیا کرتے اور لوگوں کو تو اس نے آئندہ ماہ پر ٹال دیا تھا مگر جس دکان دار کے یہاں سے راشن آتا تھا۔ وہ روزانہ کسی نہ کسی وقت بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو جاتا۔

بڑی سرد رات تھی۔ ابھی کوئی ساڑھے نو بجے کا عمل ہو گا۔ لیکن سردی زیادہ تھی۔ اس لیے سر شام ہی ہر طرف سنّاٹا پڑ گیا تھا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم دونوں کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرکے آتش دان کے سامنے بیٹھے کافی پیتے جا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے پروفیسر بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔ وہ اس وقت یونانی ڈیوما لا کے متعلق بڑی اچھی باتیں بتا رہا تھا۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردی میں آگ کے پاس سے دروازے تک جانا بڑا برا معلوم ہوا مگر میں یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا کہ کہیں اس وقت ایازنہ آیا ہو۔ دروازہ کھول کر دیکھا اندھیرے میں کوئی خاموش کھڑا تھا۔ لیکن یہ تو وہی بلائے بے درماں تھی۔ وہ ایک دم سے کمرے کے اندر آگیا اور پروفیسر کے پاس سیدھا پہنچ گیا۔

"دیکھئے صاحب آج ہمارا حساب صاف ہو جانا چاہیئے۔"

پروفیسر نے حسبِ معمول نرمی سے کہا "بھئی راشن تو تمہارے یہاں سے آہی رہا ہے۔ آئندہ مہینہ اکٹھا حساب صاف کر دیں گے۔" وہ بڑے روکھے پن سے بولا:۔

"نہیں صاحب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھ کو تو ابھی روپے کی ضرورت ہے۔"

پروفیسر نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "سیٹھ جی! ایسی بات مت کہو، اس مہینہ تم کسی طرح اپنا کام چلا لو۔ دوسرے مہینہ جی چاہے تو تم مجھ سے کچھ زیادہ لے لینا۔" وہ بڑی بدتمیزی سے بولا:۔

"اجی زیادہ تو آپ کیا دیں گے۔ جو نکلتا ہے وہی مل جائے تو بہت ہے۔"

پروفیسر بھی اب بے قابو ہوتے جا رہا تھا، بولا "خیر اس مہینہ تو آپ کو کچھ نہیں مل سکے گا۔" وہ آنکھیں نکال کر کہنے لگا۔

"ملے گا کیسے نہیں، میں آج ہی سارا حساب لے کے جاؤں گا اور ابھی۔"

اتنا کہہ کر وہ آستین چڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ بات بڑھ جاتی۔ اس لیے کہ پروفیسر کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کو کبھی غصہ

آنا ہی نہیں اور جب آتا ہے تو وہ بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے بیچ میں پڑ کر کہا۔

"شیخ جی! تم کو اپنا روپیہ چاہیئے نا۔"

وہ ذرا نرم ہو کر بولا "جی ہاں۔"

میں نے کہا۔ "ایک گھنٹہ بعد تم آ کر مجھ سے اپنا پورا حساب لے جانا۔"

وہ ایک دم رضامندی پر مائل ہو گیا "بہت اچھی بات ہے۔ میں دس بجے تک آ جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے مجھے بڑی قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

"تم اس کمینہ کی گیدڑ بھبکی سے ڈر گئے۔ ذرا تم رک تو جاتے میں اس بدتمیزی کا وہ مزا چکھاتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔" وہ بڑے جلال میں بول رہا تھا میں نے اس کی ہڈیاں نکلے ہوئے جسم کو دیکھا اور پھر اس کے مقابلہ میں شیخ جی کے تنومند جسم پر غور کیا تو ہونٹوں پر ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "اس سے جھگڑا کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کہنے لگا۔ "یہی سوچ کر تو میں چپ رہا۔ ورنہ یہ مت سمجھنا کہ میں بہت دبلا پتلا ہوں۔ ایک مکہ مارتا تو مرے ہوئے بیل کی طرح دھڑام سے فرش پر جاتا۔"

باتوں پر وقت صرف کرنے کا موقع نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے نیچے جاکر کپڑے تبدیل کئے اور اس جاڑے پالے میں ایک دوست کے یہاں پہنچا ان کو اسی وقت جگا کر روپے قرض لیے اور گھر کی طرف چل دیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پروفیسر حسن کو میں جلے کباب کی طرح غصّہ کے عالم میں چھوڑ گیا تھا۔ بڑے معنی خیز انداز میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم نے تھوڑی دیر کر دی۔ ذرا اور پہلے آئے ہوتے تو تماشہ دیکھتے، وہ اُلّو کا پٹھا شیخ جی دس بجے سے پہلے ہی نازل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایاز بھی آ گیا۔ آتے ہی اس نے اسی بدتمیزی سے تقاضہ کیا۔ تم کو بھی برا بھلا کہنے لگا۔ میں اس سے جلا تو بیٹھا ہی تھا۔ مجھ کو بھی تاؤ آ گیا۔ مگر ایاز نے مجھ کو تو ایک طرف کر دیا اور اس کے منہ پر دو تین گھونسے جو رسید کئے تو سارا طنطنہ بھول گیا۔ لگا غیں غیں کرنے۔ ایاز اس کو دروازے تک دھکّے دیتا لے گیا۔ اور نکال باہر کیا۔ شریف ہوگا تو اب کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔"

میں خاموشی سے بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دیر تک اس ہنگامہ کی ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب میں اٹھ کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اچانک مجھ کو خیال آگیا کہ اس وقت تو ایاز نے شیخ جی کو مار پیٹ کے نکال دیا۔ مگر وہ آدمی

بدمعاش قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ کالج جاتے ہوئے راستہ میں اگر اس نے پروفیسر کے خلاف "انتقاماً" کوئی کارروائی کی تو یہ بہت برا ہوگا۔ جلا برا ہوتا ہے وہ باز نہیں آئے گا۔ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ کچھ یہی سوچ کر میں فوراً ہی شیخ جی کی طرف چل دیا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ نکل کر باہر آیا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

"مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ ابھی آپ گھر گئے تھے۔ مجھ کو ذرا دیر ہوگئی۔ آپ کے ساتھ ایاز نے جو حرکت کی ہے۔ وہ بہت بری بات ہوئی مجھ کو اس کا بڑا افسوس ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، کون ایاز کس کا جھگڑا، میں گیا ہی کب تھا۔ پروفیسر صاحب یہاں خود آئے تھے، اپنی گھڑی دے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ چند ہی روز میں روپے کا بندوبست کر کے گھڑی لے جائیں گے۔ وہ تو بے چارے کتنی دیر تک خوشامد کرتے رہے اور آپ جھگڑے کی بات کر رہے ہیں۔" وہ ایک سانس میں ساری باتیں کہہ گیا اور میں سکتہ کے سے عالم میں بت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے جیب سے روپے نکالے اور اس کو سمجھانے لگا۔

"بھئی ان کے ملازم نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔" میں نے پروفیسر کا تو نام لیا نہیں سارا الزام نوکر پر رکھ دیا۔ "بہر حال آپ یہ روپے رکھ لیجئے۔

اور کل گھڑی پروفیسر کو واپس دے دیجئے گا میرے یہاں آنے اور روپے ملنے کا ان سے کوئی تذکرہ نہیں کیجئے گا۔" میں نے اس کو روپے دیئے اور اچھی طرح سمجھا بجھا کر واپس آ گیا۔

پروفیسر کی اس غلط بیانی پر مجھ کو بڑی حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا اس نے صرف ایاز کی توقیر بڑھانے کے لیے میرے سامنے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ دراصل ایک عرصہ سے ایاز اس کے پاس آیا نہیں تھا۔ اور اب وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اگر یوں سیدھے سادے طور پر ایاز کو منا کر لاؤں گا تو ممکن ہے کہ مجسمہ توڑنے والے واقعہ کے باعث میں اس سے لڑ بیٹھوں۔ لہٰذا اس نے پیش بندی کے طور پر یہ سب کچھ کیا تھا۔ بہرصورت یہ بات تو اب بخوبی واضح ہو گئی تھی کہ وہ ایاز سے زیادہ عرصہ تک قطع تعلق نہیں رکھ سکتا۔ وہ اس کی بہت بڑی کمزوری بن چکا تھا اس کمزوری کے پس پردہ کیا راز پنہاں تھا، اس کو وہی بہتر جانتا ہو گا۔

دوسرے ہی دن سے پروفیسر نے پھر ایاز کی باتیں شروع کر دیں۔ لیکن وہ جس قدر اس کے ذکر میں لطف محسوس کرتا۔ مجھ کو اتنا ہی برا معلوم ہوتا۔ البتہ مجھ کو ایاز سے ملنے کا، اس کو دیکھنے اور اس سے بات چیت کرنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس تمام عرصہ میں ایک بار بھی اس سے مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ اس کے لیے صرف دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو

پروفیسر مجھ کو ایاز سے ملانا نہیں چاہتا تھا یا پھر اس میں محض حادثات کو دخل تھا

کئی ہفتے بعد کا ذکر ہے اس روز کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی طبیعت کچھ سست تھی۔ اس لیے میں دفتر نہیں گیا تھا۔ تمام دن بستر میں پڑا رہا۔ شام کو جب پڑے پڑے الجھن ہونے لگی تو میں نے کپڑے پہنے اور باہر چلا گیا۔ اس وقت بارش بند ہو چکی تھی۔ لیکن بادل گھرے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر کیچڑ ہو رہی تھی۔ لہذا بازاروں کے چکر کاٹنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فوراً ہی واپس جانے کا بھی ارادہ نہ تھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر کھڑا میں یہی سوچ رہا تھا۔ کہ اب کیا پروگرام بنایا جائے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان میرے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ مجھ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ آگے بڑھ گیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ پھر پلٹا۔ اس دفعہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا اور جھکتے ہوئے بولا:۔

"میں نے پروفیسر الیاس کے یہاں آپ کو اکثر دیکھا ہے۔"

میں نے فوراً ہی جواب دیا۔ "جی ہاں! میں ان کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔" وہ بڑی بے تکلفی سے مسکرا کر بولا:۔

"بھئی یہ کتابیں ان کو دے دیجئے گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں ان کے یہاں آنے جانے میں بارش نے آ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

اتنا کہہ کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کچھ دور چلا گیا تو اچانک میں نے سوچا یہ ایاز تو نہیں تھا؟ وہی ہو گا بڑا اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسم بھی صحت مند تھا۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا۔ وہ خوب صورت بھی ہو گا۔ بڑی کوفت ہوئی اس وقت تو بڑی تفصیلی ملاقات ہو جاتی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ سوچا کہ اگر مل جائے تو اصرار کر کے اس کو کسی چائے خانے میں لے جاؤں گا۔ وقت بھی گزر جائے گا اور اس سے ملنے کا جو اشتیاق تھا وہ بھی پورا ہو جاتا۔ لیکن پوری سڑک میں نے دیکھ ڈالی۔ ہر ایک راہ گیر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا وہ دوبارہ نظر نہ آیا۔

واپس گھر پہنچا تو بہت تھک چکا تھا لیکن ابھی میں کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اوپر کی منزل کا دروازہ بڑے زور سے کھلا میں گھبرا کر کمرے سے باہر آ گیا۔ پروفیسر بدحواس سا لکڑی کے زینہ پر سے دھم دھم کر کے اتر رہا تھا۔ اس وقت اس کا عجیب حلیہ تھا۔ بال بکھرے ہوئے چہرے پر وحشت۔ ایک ہاتھ کوٹ کی آستین میں اور دوسرا باہر۔ میرے سامنے آیا تو بڑے تیز لہجہ میں بولا۔

"تم نے اس حرام زادے کو تو نہیں دیکھا، ابھی کھڑکی پر سے کود کر لگا ہے"
یہ کہتے ہوئے وہ گھر سے باہر آ گیا۔ میں بھی گھبرا کر اس کے پیچھے پیچھے

دوڑا۔ وہ اسی انداز سے بولتا رہا "آج اس نے وہ کمینہ پن کیا ہے کہ میں اس کو زندگی بھر معاف نہیں کروں گا" اُس کے منہ سے کف جاری تھا آواز غصہ سے لرز رہی تھی۔

"میں اس کو قتل کر دوں گا۔ آج میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا"

اس بات پر میں بھی گھبرا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی سنگین واردات ہو گئی۔ پروفیسر کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے قریب جا کر پوچھا۔

"پروفیسر صاحب آخر ہوا کیا؟ چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ ایک بارگی مجھ پر برس پڑا ..... "جی نہیں، آپ میرے ساتھ کیوں جائیں گے!"

مگر میں نے اس کی بات کا بُرا نہیں مانا۔ بہت نرمی سے کہا "آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں"

"ایک بار میں نے آپ سے کہہ دیا کہ آپ میرے ساتھ نہیں جا سکتے یہ میرا نجی معاملہ ہے، آپ اس میں بولنے والے کون؟" اس نے یہ بات اتنے زور سے چیخ کر کہی کہ راہ گیر ٹھٹک کر ہم دونوں کو دیکھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اب میں نے مزید کچھ کہا تو پروفیسر مجھ سے لڑ پڑے گا۔ وہ اس وقت بے حد خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں بغیر کچھ کہے سنے کھڑے

میں واپس آ گیا۔

کچھ دیر اپنے کمرے میں ٹھہرنے کے بعد میں نے سوچا کہ ذرا چل کر ادھر تو دیکھوں کہ آج کیا توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔ لیکن جب میں وہاں گیا تو ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ موجود تھی۔ ابھی میں کھڑا متجسس نظروں سے کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھ کو سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ لائبریری کے اندر کوئی رو رہا تھا۔ میں لپک کر وہاں گیا لائبریری میں اندھیرا تھا۔ آتشدان میں تھوڑے سے کوئلے دہک رہے تھے۔ ان کی دھندلی روشنی میں مجھ کو دیوار کے پاس کوئی زمین پر پڑا نظر آیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن میں نے ابھی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا کہ سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"خبردار جو میرے قریب آئے"

یہ تو عذرا تھی۔ شرمیلی سی سانولی رنگت کی لڑکی۔

تو کیا آج ایاز ـــــ ؟ پھر میں نے خود ہی اس خیال کی تردید بھی کر دی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ایسا ہی ہو گا۔ ورنہ پروفیسر غصے سے اتنا پاگل نہ بن جاتا۔

میں نے فوراً ہی سوئچ دبا کر کمرے میں روشنی کی۔ عذرا دیوار کے قریب اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا بال

بکھرے ہوئے تھے اور وہ چہرہ گھٹنوں میں دبائے سسکیاں بھر کر رو رہی تھی۔ میں نے اس کو دلاسا دیتے ہوئے کہا:۔

"یہ زندگی ہے۔"

وہ اسی طرح سسکیاں بھر کر روتی رہی۔

میں نے لمحہ بھر رک کر پھر کہا۔ "اگر مجھ کو سور کا بچہ ایاز مل جائے تو میں اس کا خون پی ڈالوں گا۔ ایک کمزور لڑکی پر یہ ظلم کرتے ہوئے اس کمینے کو ذرا سی غیرت بھی نہ معلوم ہوئی۔" اس نے اس دفعہ گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"کون ایاز؟"

میں چکر میں پڑ گیا۔ ایک بارگی میری زبان سے نکلا "تو کیا یہ وفیہ ـــ؟" میں جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس نے بڑے الھڑپن سے کہا "ہاں"۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حیرت و استعجاب کا مجھ پر ایسا اچانک حملہ ہوا کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

آتش دان میں سلگتے ہوئے کوئلے اب بجھ چکے تھے۔ عذرا کی سسکیاں مدھم پڑ چکی تھیں۔ بادل زور زور سے گرجنے لگے تھے۔ بارش شروع ہونے والی تھی۔ میں نے دلاسا دے کر اس کو گھر جانے پر آمادہ کیا۔

گھر سے باہر آ کر میں نے ایک ٹیکسی لی۔ اور اس کو ساتھ بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ اس نے اپنی اس حالت کے متعلق گھر پر کیا بتایا یوں میں نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ وہ رکشا کے ایکسی ڈنٹ کا بہانہ بنا کر بات کو سنبھال سکتی ہے۔ ویسے وہ خاصی سمجھ دار لڑکی تھی کوئی اور بہتر عذر پیش کر سکتی تھی۔ مجھ کو یقین ہے۔ کہ اس نے پروفیسر کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے صرف اس کے کپڑے نوچ ڈالے تھے۔ یا چہرہ پر اس کے ناخنوں کی ایک آدھ جگہ خراش لگی تھی۔ یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا تھا۔ اسی وقت عذرا کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ وہاں سے چلا آیا کم از کم اس سانولی رنگت والی لڑکی نے مجھ سے یہی بتایا تھا۔

گھر آ کر میں نے دیکھا۔ پروفیسر ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں اوپر جا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ آدھی رات گزر گئی۔ ایک بجا ڈیڑھ بجا، پھر دو۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ بار بار جھٹکے سے کھڑکھڑا جاتے۔ کمرے کا ماحول بڑا آسیب زدہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت نہ میں عذرا کے متعلق غور کر رہا تھا نہ ایاز کے متعلق۔ مجھ کو صرف اس بات کی فکر تھی کہ۔۔ پروفیسر اب تک واپس کیوں نہیں لوٹا۔ جس وقت دیوار پر لگے ہوئے گھڑیال نے دو بجائے تو بارش اور طوفانی ہواؤں کے

ملے جلے شور میں کسی نے سرگوشی کے سے انداز میں مجھ سے کہا "پروفیسر مر گیا۔ اس نے خودکشی کر لی۔" پھر جیسے ہواؤں کی چیخوں میں، بارش کی بوندوں میں، دریچوں کی کھڑکھڑاہٹ میں، یہی بات بار بار ابھرنے لگی۔

"پروفیسر مر گیا۔"

"اس نے خودکشی کر لی۔"

"پروفیسر . . . . . . ."

میرا جی چاہا کہ میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں۔

اسی وقت میں نے سنا۔ کوئی باہر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے اوپر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، بارش بڑی تیز ہو رہی تھی۔ میں صرف دروازہ پر کھڑی ہوئی کار کو دیکھ سکا۔ آخر میں نے جا کر دروازہ کھولا، سامنے پروفیسر پانی میں شرابور کھڑا تھا۔ وہ اندر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی کرسچین لڑکی بھی تھی وہ بھی بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ اوپر گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بری طرح نشہ میں دھت تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی اس نے جیب سے بوتل نکالی۔ پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے جا کر خود ہی دو گلاس اٹھا لایا۔ دونوں گلاسوں میں

شراب انڈیلی۔ اپنا گلاس تو ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ دوسرا گلاس اس لڑکی کے ہونٹوں سے لگا کر بولا۔ "روشی ڈارلنگ، ہیو، کم آن۔" اس کی آواز اس وقت پھٹے ہوئے بانس کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ گلاس لے کر پینے لگی۔ تو وہ بڑبڑانے لگا۔

"کپڑے، کپڑے تو بھیگ گئے کوئی بات نہیں۔"

اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے کپڑے اتار ڈالے اور بالکل برہنہ ہو گیا۔ میں اب تک تو خاموش کھڑا تھا۔ اب وہاں ٹھہرنا قطعی مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ اس کی ذرا نظر گھومے تو میں جھٹ سے زینہ کے دروازے پر پہنچ جاؤں۔

وہ اس لڑکی کے سر ہو رہا تھا کہ وہ بھی کپڑے علیحدہ کر دے اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا اور کچھ بے بسی سے میری جانب دیکھنے لگی۔ اس وقت پروفیسر نے بھی گھور کر میری جانب دیکھا اور جھوم کر بولا۔

"تم کون ہو جی، کون ہو بولو۔" پھر وہ اس لڑکی سے پوچھنے لگا۔ "یہ کون ہے تم بتاؤ۔"

میں نہ جانے کیوں حماقت میں بول پڑا۔ "پروفیسر صاحب! میں ہوں کشمیر۔"

وہ زور سے چیخا۔ "پروفیسر، کون پروفیسر، میں تو آباز ہوں آبا زہ پروفیسر

سالا تو لائبریری میں کتابوں پر پڑا سوتا ہوگا۔ مگر الو کے پٹھے! تم نے مجھ کو پروفیسر کیوں کہا۔ ایاز کیوں نہیں کہتے۔" وہ بری طرح بہک رہا تھا میں باہر جانے کے لیے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ پھر چلایا "حرام زادے، الو کے پٹھے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے میرے منہ پر شراب سے بھرا ہوا گلاس کھینچ کے مارا ۔۔۔!

یہ جو میری پیشانی پر صلیب کا سا نشان نظر آ رہا ہے۔ یہ اسی چوٹ کا نشان ہے۔ اب چلتے چلتے میں یہ بھی بتا دوں کہ دوسرے دن صبح میں نے دیکھا تو واقعی پروفیسر لائبریری کے اندر کتابوں پر سر رکھ کے سو رہا تھا۔ وہ اس وقت بالکل مادر زاد برہنہ تھا ۔

○

سلطان احمد خوش نویس۔ چوک منی۔ لاہور